سولھواں باب

سلجھتی گرہیں

''خدا کی قسم ڈاکٹر صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں، کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ اچھا بھلا تو بیٹھا ہوا ہوں میں۔۔۔'' حسین نے تقریباً رو ہانسا ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''ہر گز نہیں! بی پی ہائی ہے اِسکا، ابھی چلتے چلتے دو بار لڑھکا ہے۔۔۔'' مقدّم نے اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''جوان آدمی ہو، اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے تمہیں۔'' ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''اِس نے کل سے ٹھیک سے افطار کی ہے، نہ سحری۔ شاید اِسی لیے ایسا ہوا ہو گا۔'' عمر نے ڈاکٹر کو جواب دیا۔

''دیکھا! یہی سمجھانا چاہ رہا ہوں میں کب سے؟'' اُس نے تشکر آمیز نظروں سے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی؟ کونسے غم لاحق ہیں تمہیں، جو بنا کھائے پیے روزے رکھ رہے ہو؟'' ڈاکٹر صاحب موڈ میں تھے۔

''آہ! لوگوں نے پریشان اتنا کر رکھا ہے۔'' اُس نے دوسرے صوفے پر خاموش بیٹھے رضا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔

رضا کو لیکر حسین نے پناہ گاہ آنا تھا، لیکن اُس نے اِس حالت میں بچوں کے سامنے جانے سے انکار کر دیا تو حسین اُسے اُسکے فلیٹ لے آیا، مقدم بھی ساتھ ہی تھا لیکن فلیٹ کے نیچے حسین کی اپنی طبیعت ہی بگڑ گئی، چہرہ سرخ ہونے لگا اور سر بھی گھومنے لگا۔ اُسکی حالت دیکھ کر مقدم کو تشویش ہوئی تو اُس نے عمر کو فون کیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو لے آئے، وہ اپنے ساتھ علی اور ڈاکٹر کو بھی لے آیا۔ نوید بھی خاموشی سے ساتھ آ گیا تھا۔ اب وہ سب رضا کے فلیٹ پر اکھٹے تھے، جبکہ حسین ڈاکٹر کو یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔

''کسی خاتون واتون کا چکر تو نہیں ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے رازداری سے پوچھا تھا۔

''لاحول ولا قوۃ! شادی شدہ ہوں میں۔'' حسین نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا تو ڈاکٹر کے چہرے پر بیساختہ مُسکراہٹ آئی تھی۔

''تو یقیناً دوسری کا چکر ہوگا۔'' ڈاکٹر صاحب بھی باز نہیں آرہے تھے۔

''کیوں اِسکا گھر تباہ کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟'' مقدّم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو پھر ایسی حالت کیوں بنا رکھی ہے؟''

''یہ میری اولادوں نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ کیا کروں؟ پورا رمضان ایسے ہی گزرا ہے، افراتفری میں۔'' اُس نے ایک نظر اپنے دوستوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو نوید اور رضا کے علاوہ سب کے چہروں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''اب میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں، تمھیں کوئی میڈیکل ایشو تو نہیں ہے؟'' اب کہ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں نے بس اپنی دواؤں میں کوتاہی برتی ہے، شاید اِس لیے ایسا ہوا ہے۔ ورنہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ روانی میں بول گیا۔ پہلی بار رضا نے بھی چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔

''کونسی دوائیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''آں۔۔۔'' وہ گڑبڑایا۔

''جلدی بتاؤ!'' ڈاکٹر صاحب کو غصّہ آیا۔

''اصل میں۔۔۔ میرا ایک گردہ نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھنے میں تھوڑی بد احتیاطی ہو رہی ہے دو روز سے، اِس لیے ایسا ہو گیا ہے۔'' اُس نے ذرا رک رک کر مگر مسکراتے ہو وضاحت دی تھی، وہاں جامد سناٹا چھا گیا۔ سانسیں جیسے رک سی گئی تھیں۔

''اوہ! تو یہ کیسے ہوا؟ اور کب؟'' ڈاکٹر صاحب نے افسوس سے پوچھا۔

''چار سال ہو گئے ہیں۔ بس! کوئی انفیکشن ہوا تھا، اور وہ بگڑ گیا، پھر گردہ فیل کروا کر ہی گیا۔ لیکن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دس سالوں میں کیا کیا ہو گیا تھا؟ یہ ایک دہائی تھی یا ایک صدی؟

''ہاں! ایک گردے کے ساتھ بھی ساری زندگی نکالی جاسکتی ہے۔بس! خیال رکھا کرو اپنا۔اور ابھی کوئی ہلکی پھلکی غذا کھاؤ۔'' وہ ہدایت دیتے اُٹھ کھڑے ہوئے، عمر انہیں باہر تک چھوڑنے گیا تھا۔

''ہونہہ! ہلکی پھلکی غذا۔۔۔میں تو ابھی پوری پلیٹ بریانی کھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' حسین نے اُنکے پیچھے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارا ایک گردہ نہیں ہے؟'' علی حیرت کے جھٹکے سے ابھی ابھی باہر آیا تھا۔

''کیا میں نے اتنی دیر یہاں فارسی بولی تھی؟'' اُس نے مقدّم کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو علی نے گھورا۔

''پر یہ اچانک کیسے ہوا؟'' مقدّم کے لہجے میں بھی پریشانی در آئی۔

''بس! آئی فون کی ضرورت تھی تو سوچا بیچ دوں۔'' اِس آدمی سے کوئی سنجیدہ بات کرنا واقعی بیکار تھا۔

''تمہیں احتیاط کرنی چاہیے۔'' عمر نے واپس آتے ہو کہا تھا۔

''احتیاط؟ یہ بریانی کھانے کی باتیں کر رہا ہے۔'' مقدّم نے اُسے جواب دیا تھا۔

''بریانی کھانے سے کون سا میرے واحد گردے کو کوئی فرق پڑ رہا ہے؟'' وہ بیزار ہوا۔اپنے مسائل وہ ایسے ہی ہنستے کھیلتے نظر انداز کرتا تھا۔

''چپ کر کے بیٹھے رہو! اور جو گھر میں پڑا ہے وہ کھاؤ۔'' مقدّم نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''اِسکے گھر میں چوہوں کے کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوتا، میں تو پھر انسان ہوں۔'' اُس نے رضا پر چوٹ کی پر وہ اب بھی خاموش ہی رہا۔

''ٹھیک ہے! میں چلتا ہوں اب۔'' یکدم ہی کافی دیر سے خاموش بیٹھا، نوید کھڑا ہوا تو سب نے ایک ساتھ اُسے دیکھا۔

''اللہ حافظ!'' وہ کسی کو بھی دیکھے بنا، سنجیدگی سے کہتا باہر نکل گیا۔

''دیکھو ذرا اِس نانہجار کو! نہ ہی دھیان رکھنے کو کہا، نہ خیال رکھنے کو۔بس اپنے جانے کی اطلاع دیتا نکل گیا۔'' حسین نے صدمے جیسی کیفیت سے کہا تو علی بیساختہ ہنسا تھا۔

’’وہ ایس ایس پی ہے۔ بہت کام ہوتے ہیں اُسے۔‘‘ اُس نے جتایا۔

’’ہاں ! اور ہم فارغ ہیں۔‘‘ اُس نے منہ بنایا۔ پھر یکدم ہی بولا ’’تمہیں معلوم ہے؟ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے اِس وقت؟‘‘

’’بریانی کھانا؟‘‘ سوال مقدم نے کیا تھا۔

’’نہیں ! جناب ایس ایس پی نوید عالم کو کم از کم۔۔۔‘‘ چٹکی بنا کر کم از کم کا اشارہ کیا۔ ’’کم از کم بھی مسکراتے ہوئے دیکھنا۔‘‘ اُس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

’’تم لطیفہ سنا دیا کرو نا اُسے۔‘‘ مقدّم نے مفت مشورہ پیش کیا۔

’’میں جوکر ہوں؟‘‘ اُس نے ناراضگی سے پوچھا تو مقدّم نے سر تا پاؤں اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’مجھے نہیں لگتا کہ ہم اُسے کبھی ہنستا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔‘‘ علی نے دکھ بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی رضا کے متعلق بات نہیں کر رہا تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ احساس ندامت میں مبتلا ہو۔

’’لگتا تو مجھے بھی نہیں ہے، پر میں نے ہنسنے کی نہیں، مسکرانے کی بات کی ہے۔‘‘ حسین نے تصحیح کی۔

’’آہ ! یہ تو مسکرانا بھی بھول چکا ہے۔‘‘ عمر نے اُداسی سے سرد آہ بھری تھی۔

’’اور انسانوں کی طرح برتاؤ کرنا بھی بھول چکا ہے۔ جب دیکھو مار دھاڑ !‘‘ یہ اچانک بڑبڑاہٹ رضا کی تھی، سب نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

’’کیا مطلب اِس بات کا؟‘‘ مقدم نے پوچھا تو وہ سیدھا ہوا، ایسے جیسے کسی سوچ سے، یا کسی خول سے اچانک ہی باہر آیا ہو۔

’’تمہیں معلوم ہے اِس نے ایک پولیس والے کی آنکھ میں کیل گھونپ کر اُسکی آنکھ پھاڑ دی ہے؟‘‘ اُس نے پوچھا۔

’’آنکھ پھاڑ دی؟ نوید نے؟‘‘ عمر کو یقین نہ آیا۔

''ہاں! نوید نے۔۔۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''، علی نے پوچھا۔

''ارے! یہ دو تین دن پہلے کسی نے میرے گھر پر بچوں کی ٹیچر پر حملہ کیا تھا۔اُسی روز جس دن تمہاری بیٹی نے اسکول میں ایک بچے کا سر پھاڑ دیا تھا۔''اُس نے روانی میں کہا تو علی کی ساری دلچسپی ہوا ہوئی۔

''یہ بکواس کرنی ضروری تھی؟''اُس نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

''اُسی روز میں جب گھر واپس آیا۔۔۔''رضا نے اسے یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی تھی۔اُسکے انداز میں اچانک آنے والی تبدیلی ایسی تھی، جیسے کوئی صدیوں کسی ملبے تلے دبے رہنے کے بعد زندہ باہر نکال لیا گیا ہو۔ جیسے زمین پھاڑ کر، کوئی کونپل پوری قوت سے پھوٹ پڑی ہو۔ جیسے آج پینتیس سالوں کا بوجھ یکبارگی ہی اُتر گیا ہو۔

تیرہویں فلور سے ایلیویٹر لینے کی بجائے سیڑھیوں سے، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُترتا نوید، عمارت کے باہر یکدم ہی رکا۔ عمارت کے نیچے فوڈ اسٹریٹ تھی۔آج عید کا چاند نہیں نکلا تھا اور کل تیسواں روزہ تھا۔ عوام بڑے جوش و خروش سے آخری روزے اور عید کی تیاری میں مصروف تھی۔نیچے موجود فوڈ سٹریٹ بھی بھری پڑی تھی۔

''اِس قوم کی زندگی کا مقصد صرف کھانا ہی ہے۔''اُس نے بیزاری سے سوچا اور آگے بڑھنے لگا۔ لیکن اچانک ہی اُسکی نظریں مشہور زمانہ ریسٹورانٹ کے بل بورڈ پر پڑیں تو اُسکے قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔

''میں۔۔۔میں تصّور بھی نہیں کر سکتا یہ۔۔۔۔ مطلب۔۔۔ کیسے؟''مقدّم کے منہ سے الفاظ ہی ادا نہیں ہو رہے تھے۔رضا انہیں نوید کا کچھ روز قبل کا کارنامہ سنا چکا تھا۔

''وہ پولیس والا ہے، اُسکا کام ہے یہ۔''عمر نے اُس سے زیادہ خود کو باور کروایا تھا۔

''دنیا میں اور بھی پولیس والے ہوتے ہیں، لیکن ایس ایس پی صاحب کچھ زیادہ ہی وحشی ہیں۔''یہ جواب حسین کی طرف سے آیا تھا۔

''یعنی! اُس نے آنکھوں کے اندر پورا خنجر ہی گھونپ دیا؟ میرا تو سوچ کے ہی دل کانپ رہا ہے، اور اُس آدمی کا ہاتھ بھی نہیں کانپا؟'' مقدّم نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔ اُسی لمحے فلیٹ کی بیل بجی۔

''اِس وقت کون آ گیا؟'' حسین نے رضا کو دیکھا۔

''یقیناً پڑوس والی آنٹی ہوں گی۔'' اُس نے اندازہ لگایا۔

''کیوں؟''

''وہ مجھے جب بھی اپارٹمنٹ میں دیکھتی ہیں تو اکثر رات کا کھانا بھیج دیتی ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود۔'' اُس نے کہا۔

''تم بیٹھو میں دیکھ لیتا ہوں، ویسے بھی مجھے اب جانا ہی ہے۔'' عمر کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''شکریہ یار! اگر پڑوس سے کوئی ہو تو معذرت کر لینا۔'' اُس نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکلا۔

''یہ تمہارے پڑوسیوں کو کچھ زیادہ ہی ہمدردی نہیں ہے تم سے؟'' حسین کے ذو معنی جملے کو صرف وہی سمجھ سکا تھا۔ لہٰذا نظر انداز کرنے پر ہی اکتفا کیا۔

''اب تمہیں کیا ہوا؟'' مقدّم کی نظریں خاموش کھڑے، کسی گہری سوچ میں مبتلا علی پر پڑیں تو پوچھا۔

''مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ نوید اتنا وحشی بھی ہو سکتا ہے؟ مطلب اتنی درندگی؟ اتنا خون خرابہ؟ مجھے تو اب اُسکے انسان ہونے پر بھی شک ہونے لگا ہے۔ حد ہوتی ہے یار! مطلب ہو کیا گیا ہے اِس آدمی کو؟'' علی کی چلتی زبان کو فلحال مقدّم کی اشارہ کرتی آنکھیں، نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''یہ ساری باتیں تم اُسکے سامنے تو کہہ کر دیکھو!'' حسین نے مسکراتے ہوئے، آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے، ذرا معصوم چہرہ بناتے ہوئے، اُسے دیکھا۔

''میں ڈرتا نہیں ہوں اُس سے اوکے؟ میں تو بس! اُسکی حرکتوں سے پریشان ہوں۔ پتہ نہیں اپنی سروس میں اُس نے، اس وحشیانہ طریقے سے کتنے لوگوں کا قتل کیا ہو گا؟ کبھی کسی کی آنکھ پھاڑ دیتا ہے، کبھی کسی کا سر، تو کبھی کسی سے وعدہ لیکر اُسکا ہاتھ اُڑا دیتا ہے۔ مطلب آدمی

ہے کہ زومبی؟ مجھے تو شک ہونے لگا ہے کہ مرحوم مائیکل کی طرح ایس ایس پی نوید عالم کی بھی ایک ڈائری ہوگی، جس میں اُس نے اپنے ہاتھوں معذور ہوئے انسانوں کی تصاویر جمع کر رکھی ہوں گی۔ سائیکو پیتھ ہے وہ پورا، سائیکو!'' علی کا تو خاصا ہی یہی تھا کہ جب بولتا تھا۔ بنا سوچے سمجھے، اور بنا آگے پیچھے دیکھے بولتا تھا۔

''اور اگر وہ تمہارے پیچھے کھڑا سب سن رہا ہوا تو؟'' حسین نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مقدّم سر جھکائے اپنی مسکراہٹ ضبط کر رہا تھا، جبکہ رضا یہاں وہاں دیکھتے کان کھجا رہا تھا۔

''تم دو بچوں کے باپ ہو حسین! اب تمہیں یہ ٹین ایجر والے مذاق زیب نہیں دیتے۔'' اُس نے بیزاری سے کہا۔

''اچھا!'' حسین نے اچھا کو ذرا لمبا کھینچا۔ ''ذرا! پیچھے تو دیکھو!'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی کو اب غصّہ آیا۔

''کیا ہے پیچھے؟ کیا۔۔۔'' اور اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ نوید عالم واقعی پیچھے کھڑا تھا۔ بالکل اُسکے پیچھے۔۔۔ دو قدم کے فاصلے پر، دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے، سنجیدہ مگر سپاٹ چہرے کے ساتھ اُسے دیکھتا بلکہ نظروں سے سالم نگلتا ہوا۔ اُسکے پیچھے عمر سینے پر بازو باندھے، سر نیچے جھکائے کھڑا تھا، آیا علی اُسکی مسکراہٹ دیکھ نہ لے۔

''تت۔۔۔ تم؟۔۔۔ تم واپس کیسے آ گئے؟'' اُس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''کیوں؟ مجھے نہیں آنا چاہیے تھا؟'' نوید کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

''سب خیریت؟ تم تو جانے کا کہہ کر گئے تھے؟'' گھر رضا کا تھا، لہٰذا میزبانی کے آداب بھی اُسی پر واجب تھے۔ فوراً نوید سے پوچھا۔ اُس نے گہری سانس لیکر ایک ہاتھ آگے کیا، اور ہاتھوں میں پکڑا لفافہ، حسین کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''یہ تمہارے لیے۔۔۔'' بے تاثر چہرے کے ساتھ حسین کو مخاطب کیا۔

''میرے لیے؟'' اُس نے حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ شہادت کی انگلی سینے پر رکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''ہاں! تمہیں بھوک لگی تھی۔ مجھے راستے میں ملا تو لے آیا۔'' بس! اِس سے زیادہ وضاحت نوید کے بس کی بات نہیں تھی۔

''راستے میں پڑا ہوا ملا؟'' یہ سنجیدہ سوال مقدّم کا تھا۔اب کہ عمر نے اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی تھی،نوید نے نظرانداز کیا۔حسین نے براؤن لفافہ کھول کر دیکھا،تو اُس میں ڈسپوزیبل باکس میں پیک ہوئی بریانی تھی۔اور ایک نہیں تین ڈبّے تھے۔وہ یقیناً رضا اور مقدّم کے لیے بھی لایا تھا۔کیونکہ وہ دونوں پہلے ہی آج رات رضا کے ساتھ رکنے کا اعلان کر چکے تھے۔اُسکی مرضی کے بغیر۔۔۔

''یہ تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟'' حسین نے ذرا ڈرنے کی اداکاری کی،نوید سنجیدگی سے اُسے دیکھتا رہا۔اِس وحشی آدمی کو آج تک اظہار کرنے کا سلیقہ نہیں آیا تھا۔وہ واقعی گدھا تھا!

''نہیں میرا مطلب! قصائی کو جب مرغی ذبح کرنی ہوتی ہے،تو وہ اُس پر،ایسے ہی مہربانیاں کرتے دیکھا جاتا ہے۔تم۔۔۔کہیں۔۔۔اگلا وعدہ مجھ سے تو نہیں لینے والے؟''نوید نے ایک نظر بے پر کی ہانکتے حسین کو دیکھا،پھر سر جھٹک کر علی کی طرف رخ کیا۔

اور اس ایک رخ بدلنے کے دوران۔۔۔

اُس ایک لمحے میں۔۔۔

فقط پلک جھپکنے میں۔۔۔

ہر شخص کو یہ گمان گزرا کہ نوید عالم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

بس ایک ذرا سی مسکراہٹ۔۔۔

جو اُس نے پلک جھپکنے میں ہی غائب کر دی تھی۔وہ مُسکرایا تھا؟ یا یہ اُنکی نظروں کا دھوکا تھا؟ پر نہیں! اتنی نظریں ایک ساتھ دھوکا نہیں کھا سکتیں۔حسین کا تو مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا تھا،پانی پیتے ہوئے مقدّم سرکا اور کھانسا تھا،جبکہ نوید نے سب کو یکسر نظرانداز کر کے علی کو دیکھا۔

''کیا تم گاڑی میں آئے ہو؟'' یہ سوال انتہائی بے تکا تھا۔کیونکہ نوید بہت اچھے سے جانتا تھا کہ علی گاڑی میں ہی آیا ہے،بلکہ خود وہ بھی،ابھی علی کی ہی گاڑی میں یہاں تک آیا تھا۔درحقیقت! وہ مرکزِ نگاہ نہیں بننا چاہتا تھا،اُسے توجہ نہیں ملی تھی،اِس لیے توجہ اُسے آج بھی زہر لگتی تھی۔توجہ کا مرکز بننے سے اُسے آج بھی وحشت ہوتی تھی۔توجہ۔۔۔اُسکا دم گھٹاتی تھی۔

''ہاں!''اُس نے بس اتنا ہی کہا۔

''مجھے گھر تک چھوڑ دو، میں پیدل آیا ہوں۔''اُس نے پوچھا نہیں تھا، حکم دیا تھا۔

''مم۔۔۔میں؟''علی نے مصنوئی مسکراہٹ کے ساتھ تھوک نگلا۔

''ہاں!'' نوید نے کندھے اُچکاتے رُخ بدلا تا کہ دروازے کی طرف جا سکے۔

''میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں، تمہارا گھر میرے راستے میں ہی ہے۔''عمر نے علی کی مشکل آسان کرنی چاہی۔

''تمہیں میرا گھر کیسے معلوم؟''اب کہ سنجیدگی سے عمر سے سوال کیا گیا۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔ علی نے بتایا تھا۔''اب کہ عمر بھی گڑبڑا گیا۔

''میں نے کب بتایا؟''علی نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔

''اور علی کو میرا گھر کس نے بتایا؟''نوید نے علی کو سنجیدگی سے دیکھا۔ خالص پولیس والا انداز۔۔۔۔

''وہ۔۔۔وہ شیراز نے۔۔۔اُسی نے دیا تھا ایڈریس۔۔۔''دفاع کا اصول نمبر پندرہ! جو موقع پر موجود نہ ہو، قصور اُسی کے سر ڈال دو۔

''پر شیراز کو میرا گھر نہیں معلوم!''اُسکے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک تو یہ ایس ایس پی بھی نا! تفتیش سے باز نہیں آتا کبھی۔

اب کہ وہاں نہایت ہی نامناسب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ انگریزی میں جسے کہتے ہیں

Awkward silence

''مجھے علی سے کچھ ضروری کام ہے۔ اسی لیے تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔''نوید نے عمر کو جواب دیتے اُسکی پیشکش مسترد کی۔ علی کا خون ہی خشک ہو گیا، کبھی جو وہ زبان چلانے سے پہلے سوچ لے۔

''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا حسین!''عمر نے اُن سب کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل گیا۔

''میں باہر ہی ہوں۔''نوید، علی کو کہتا ایک نظر سب پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

''کہا بھی تھا کہ پیچھے دیکھ لو! مگر نہیں۔۔۔میں تو ڈرتا نہیں ہوں نوید سے۔۔۔''حسین نے ہنستے ہوئے کہا تو علی نے کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اللہ حافظ!''اُس نے بیزاری سے منہ بناتے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔

''علی!''یکدم ہی رضا نے اسے پکارا تو وہ پلٹا۔

''ہاں؟''

''اللہ کی امان میں۔۔۔''اُس نے کہا تو سنجیدگی سے تھا پر حسین اور مقدم قہقہ لگا کر ہنسے تھے۔علی منہ بناتا باہر نکل گیا،نوید سے تو بس اللہ کی امان ہی بچا سکتی تھی۔

اور انہیں محسوس بھی نہ ہوا کہ۔۔۔

خلا بھرنے لگا۔۔۔

دراڑ بند ہونے لگی۔۔۔

فاصلے سمٹ گئے۔۔۔۔

جو مسافر تھے واپسی کے۔۔۔

وہ منزل سے پہلے ہمسفر ہو گئے۔۔۔

----------+---------+--------

علی نے سیٹ بیلٹ لگاتے ہوئے،چور نظروں سے پسینجر سیٹ پر بیٹھے،موبائل میں مصروف نوید کو دیکھا۔

''جیبیں خالی ہیں،کوئی خنجر و نجر نہیں دکھ رہے۔''اُس نے خود کو تسلی دیتے گاڑی اسٹارٹ کی۔

''بیلٹ کے پاس بھی کوئی گن وغیرہ نہیں ہے۔ گاڑی کا لاک کھلا رکھتا ہوں۔ اگر اِس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو یہیں سے چھلانگ لگا دوں گا۔'' گاڑی چلاتے اُس نے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا۔

''دو پسٹل میرے بوٹس میں ہوتی ہیں۔ ایک کمر میں پیچھے۔ اور ایک آستین میں رکھتا ہوں، چھوٹی سی ہوتی ہے۔'' علی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُسکے چہرے پر خطرناک حد تک سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''تت۔۔تو؟'' اُس نے تھوک نگلا۔

''تم ہی دیکھ رہے تھے غور سے۔ اسی لیے بتا دیا۔'' اُس نے موبائل جیب میں ڈال کر، سامنے نظر آتی سڑک پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ علی بری طرح شرمندہ ہوا۔ کافی دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔

''تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا نا؟'' علی نے نوید سے پوچھا۔

''مجھے؟ نہیں تو!'' اُس نے اتنی حیرت سے کہا کہ علی کو اُسکی یاداشت پر شک گزرا۔

''تم نے ابھی اندر نہیں کہا تھا عمر سے، کہ تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟'' اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں! یہی کام تھا۔ گھر جانا تھا مجھے پر گاڑی نہیں تھی۔'' اُسکی سنجیدگی میں ذرا جو فرق آیا ہو۔ علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہی کام تھا؟'' اُسے یقین نہ آیا۔ نوید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو عمر کے ساتھ ہی چلے جاتے۔'' اُس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا تو نوید نے رخ موڑ کر اُسے بغور دیکھا۔

''عمر نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے بھائی ہو، دوست ہو، مجھے بہت عزیز ہو۔'' گاڑی میں نوید کی سنجیدہ اور بھاری آواز گونجی۔ ''اُس نے نہیں کہا تھا کہ تمہیں میری ضرورت ہو تو بلا جھجھک کہہ سکتے ہو۔'' اُسکو اُسی کے الفاظ واپس لوٹاتا نوید خاموش ہوا۔ علی بھونچکارہ گیا۔ یا اللہ! یہ آدمی!

اور وہ آدمی کندھے اُچکاتا سنجیدگی سے سامنے دیکھنے لگا تھا۔

''میں نے تمہاری ڈرائیوری کرنے کے لئے وہ سب نہیں کہا تھا۔'' علی بھی تمام لحاظ بلائے طاق رکھتے ہوئے بولا تھا۔

''میں نے تو یہی سمجھا تھا۔''کمال بے نیازی تھی بھئی !

''تمہیں میرے گھر کا ایڈریس کیسے معلوم ؟''ایس ایس پی صاحب، کبھی بھی، کہیں بھی، کسی بھی مقام پر تفتیش شروع کر سکتے تھے۔یہ آپکا کام تھا کہ آپ تیار رہیں۔ ہر وقت۔۔۔ہر لمحہ۔

''میں نے فرّخ صاحب سے ہسپتال میں لیا تھا۔''اُس نے کہا،اب وہ فرخ صاحب سے تو جا کر سوال نہیں کرنے والا۔

''فرّخ صاحب ایسے ہی کسی کو بھی میرا ایڈریس نہیں دیتے۔''اُس نے بڑے سکون سے کہا تھا۔اب کہ علی کے پاس کوئی جواب نہیں بچا۔

''ہونہہ۔۔۔یہیں روک دو۔''سوسائٹی کے دروازے کے قریب نوید نے کہا تو علی نے گاڑی روک دی۔ نوید نے سیٹ بیلٹ کھولی، پھر دروازہ کھولا لیکن اُترا نہیں۔بلکہ پلٹ کر علی کو دیکھا جو اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں نے اُس رات تمہیں جو بھی کہا، اگرچہ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرے الفاظ سخت تھے۔تمہیں برا لگا ہو تو آئی ایم سوری!''معذرت بھی دھونس جما کر کی تھی اِس آدمی نے۔علی کو اپنی سماعتوں پر لمحوں کے لیے شک گزرا۔اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے بغور دیکھا۔

''جو کچھ تم غصّے میں کہہ دیتے ہو، بعد میں معذرت کرنے سے اُسکا اثر زائل نہیں ہوتا۔''اِس بار بھونچکا ہونے کی باری نوید کی تھی، جبکہ اُسکے الفاظ اُسے ہی واپس لوٹانے کے بعد علی مزے سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میرے ایک دوست کے سنہری الفاظ ہیں۔سوچا تمہیں بھی بتادوں۔''اُس نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ہونہہ۔۔۔حُسین کا دوست!

نوید کچھ لمحے حسین کے دوست کو سنجیدگی سے دیکھتا رہا، پھر آنکھیں چھوٹی کیں، آنکھ کے برابر میں لگا زخم کا نشان گہرا ہوا۔

''میں اتنا گدھا نہیں ہوں کہ کوئی میرا پیچھا کرے اور مجھے معلوم نہیں ہو۔''اور۔۔۔علی سفیر۔۔۔بہت اچھے سے اِس جملے کا مطلب سمجھتا تھا۔آخری ملاقات کے بعد اُس نے خاموشی سے نوید کا پیچھا کیا تھا، جانتا تھا کہ وہ اپنا گھر نہیں بتائے گا۔پر وہ اُسکا گھر جاننا چاہتا تھا، کہ

کبھی جا کر اُس سے مل لے۔ کبھی یعنی۔۔۔۔جب اُنکے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہو۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اُس نے عمر کو نوید کے گھر کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔اُسے کیسے معلوم ہوا؟اب یہ تو وہ ہی جانتا تھا۔

''خدا حافظ !''نوید نے جتاتے ہوئے انداز میں خدا حافظ کہااور گاڑی سے اتر گیا۔ پیچھے بیٹھا علی دل سے مسکرایا تھا۔

----------+---------+--------

''آہ !ایس ایس پی صاحب کواللہ جنت کی حوریں نصیب کرے۔آمین !''بریانی سے لطف اٹھاتے حسین نے بڑے دل سے اُسے دعا دی تھی۔

''یہ کیسی دعا ہے ؟''مقدّم ہنسا۔

''مجھے ایسی ہی دعائیں آتی ہیں۔''اُس نے کندھے اچکاتے کہا۔

''ویسے نوید سے مجھے ایسی مہربانی کی امید ہر گز نہ تھی۔''مقدّم نے چمچ کی مدد سے بریانی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب اُس نے مہربانی کر ہی دی ہے،تو تم بھی اُس سے اپنے تنازعے حل کر لو۔''میز پر سے کوک کا کین اُٹھا کر منہ سے لگاتے رضا نے حسین سے کہا تھا۔میز کا وہی حال تھا،جو کسی بھی دوستوں کی محفل میں ہو سکتا ہے۔ بریانی کو پلیٹوں میں نکالنے کی زحمت ہر گز نہیں کی گئی تھی۔لہٰذا تینوں ڈسپوزیبل ڈبّے میں ہی کھا رہے تھے۔کوک کے کئی کین درمیان میں الٹے سیدھے پڑے تھے،جو مقدم نے منگوائے تھے۔

''کیسا تنازعہ ؟''اُس نے بھی لاعلمی کی انتہا کر دی۔

''مجھ سے تو کہہ رہے تھے کہ میری بھی عزت نفس ہے،میرے اندر بھی انا ہے۔جب تک نوید معافی نہیں مانگے گا میں بات نہیں کروں گا۔''مقدّم نے اُسکی نقل اُتاری تو رضا بیساختہ ہنسا تھا۔''ایک بریانی کی پلیٹ کی خاطر تم نے اپنی انا کا سودا کر دیا حسین؟ میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔''مقدّم نے بات جاری رکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔

''وہ آئی فون کی خاطر اپنا گردہ بیچ سکتا ہے تو انا کیا چیز ہے؟'' یہ چوٹ رضا نے کی تھی۔ اچھا ہوا جو وہ دونوں ساتھ رک گئے، ورنہ رضا الٰہی اکیلے ہوتا تو ساری رات ایک نیا ڈپریشن اپنے لیے تیار کر چکا ہوتا۔

''کھانے کے معاملے میں میری کوئی انا نہیں ہوتی، نہ میں کسی کا ہوتا ہوں اور نہ کوئی میرا۔ لہٰذا کھانے کے بعد میری انا واپس آجائے گی۔'' حسین تو تھا ہی ڈھیٹ۔

''نوید نے علی کی ساری بکواس سن لی تھی۔'' رضا کو یکدم ہی یاد آیا۔

''اسی لیے تو ساتھ لیکر گیا ہے اُسے۔ اب تک تو ٹھکانے بھی لگا چکے ہوں گے ایس ایس پی صاحب اُسے۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے پر تمہیں علی کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے؟'' کھانا ختم کر کے، ڈبہ میز پر رکھتا حسین مشکوک ہوا۔

''میں کیوں فکر کروں گا اُسکی؟ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ علی کو ذرا! اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہیے۔ نوید برا بھی مان سکتا ہے۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''دوست ہو گا، تو برا نہیں مانے گا۔'' مقدّم نے کہا تو رضا ساکت ہوا۔ دوست تو برا نہیں مانتے۔۔۔ واقعی نہیں مانتے۔

''تم پناہ گاہ جاؤ گے؟'' حسین نے پوچھا۔

''نوید کہہ رہا تھا کہ اُس نے جزا کو اطلاع دے دی ہے۔ میں ابھی بچوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا۔ صبح جاؤں گا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''جزا کون؟'' مقدم نے بس یہی لفظ سنا تھا جیسے۔

''وہ خاتون جو اِسکے بچوں کی ٹیچر ہیں۔'' حسین نے یاد دلایا۔

''وہ جنہیں پولیس گرفتار کرنے آئی تھی؟'' اُسے یاد آیا۔

''ہاں!'' حسین نے کہا۔

''اچھا اچھا!'' اُس نے سر ہلاتے کوک کا کین منہ سے لگایا۔

''ایس ایس پی صاحب کی سگی بہن ہے وہ۔۔'' اگلے ہی لمحے کوک فوارے کی صورت اُسکے منہ سے باہر آئی تھی۔

''کیا کر رہے ہو؟'' رضا نے پیچھے ہوتے جھنجھلا کر کہا۔ حسین تو اپنے تیئں انکشاف کر کے مُسکرا رہا تھا۔

''ایس ایس پی کی بہن اِسکے گھر میں کیا کر رہی تھی؟'' مقدّم کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ابھی بتایا ہے اُس نے کہ بچوں کی ٹیچر ہے وہ۔'' رضا چڑا تھا۔

''اچھا جبھی نوید نے اُس پولیس والے کی آنکھیں پھاڑی ہیں۔'' مقدّم کو اب سمجھ آیا تھا۔

''ہاں ٹیوب لائٹ! تو تم کیا سمجھے تھے؟'' حسین نے پوچھا۔

''میں تو سمجھا کہ شاید رضا نے شکایت کی ہو گی تو اُس نے غصّے میں ایسا کیا۔ وہی میں سوچ رہا تھا کہ بھلا ایک ہی لڑکی کے لئے نوید نے دو بار اتنا غصّہ کیوں کیا؟'' اُسے اب سمجھ آ رہا تھا۔

''ظاہر ہے، بہن ہے اُسکی۔'' رضا نے کہا۔

''تمہیں معلوم تھا؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''جس دن سے معلوم ہوا ہے، اُس دن سے ہی تو بیچارہ اتنا ڈرا ہوا ہے۔'' رضا کے بولنے سے پہلے حسین نے جواب دیا تھا۔

''میں کیوں ڈروں گا؟ میں نے کونسا ایس ایس پی کی بہن پر آواز کسی ہے؟ عجیب!'' رضا نے روانی میں کہا تھا۔ لیکن آج اُسکا انداز اتنا ہلکا پھلکا تھا جتنا کبھی یونیورسٹی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟'' اُس نے دونوں کو سنجیدگی سے گھورا۔

''تمہارے منہ سے ایس ایس پی سن کر اتنا اچھا لگا کہ بس!'' مقدّم نے کہا۔

''اچھا بھلا نام ہے بیچارے کا، کب سے دونوں ایس ایس پی کیے جا رہے ہو۔ میری زبان پر بھی چڑھا دیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا تو ایک بار پھر دونوں ہنسے تھے۔ آج اُسکے دوست نہ ہوتے تو شاید پچھلے دنوں کے واقعات کے اثر سے نکلنے میں اسے صدیاں لگ جاتیں۔

کاش! دس سال پہلے بھی وہ اپنے دوستوں کو سب بتا دیتا۔ بتا دیتا تو اتنے کاش نہ ہوتے اُسکی زندگی میں۔

----------+---------+--------

علی گھر میں داخل ہوا تو نشمیہ سامنے کھڑی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

''نشمی!'' وہ اسے روتا دیکھ کر گھبرایا۔

''بابا!'' وہ روتے ہوئے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اُسکی جانب بڑھی تاکہ وہ اُسکو گود میں لے لے۔ علی نے تیزی سے اُسے گود میں اُٹھایا۔

''کیا ہوا نشمیہ؟ کیا ہوا بیٹا؟'' وہ اُسکا چہرہ صاف کرتے پریشانی سے بولا اور آس پاس دیکھا۔ نہ سفیر صاحب نظر آ رہے تھے اور نہ ہی فاطمہ۔

''بابا! امی کو چوٹ لگ گئی۔'' اُس نے روتے روتے کہا۔

''چوٹ لگ گئی؟'' اُسے سمجھ نہ آیا۔

''ابّا کہاں ہے؟'' وہ پریشان ہو رہا تھا۔

''امی کے پاس۔۔۔'' علی اُسے گود میں لیکر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا۔ اوپر سے کسی کی بری طرح کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ آواز ایسی خطرناک تھی جیسے کسی کا حلق تک چھل گیا ہو۔ وہ بنا کچھ سوچے سمجھے فاطمہ کے کمرے تک گیا پر کمرے کے باہر اُسکے قدم رک گئے۔

فاطمہ بستر پر لیٹی بری طرح کھانس رہی تھی۔ اسکے پاس دو عدد خاتون نرس کے لباس میں موجود تھیں۔ ایک اُسکا سر سہلا رہی تھی، دوسری اُسکے برابر آکسیجن ماسک لیے کھڑی تھی، برابر میں ہی درمیانے سائز کا آکسیجن سلینڈر رکھا تھا۔ قریب ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا اُسکے ہاتھوں پر ڈرپ لگا رہا تھا۔ یقیناً وہ ڈاکٹر تھا۔ سفیر صاحب پریشان صورت کے ساتھ کمرے کے دوسرے کنارے پر کھڑے تھے، احمد اُنکی ٹانگوں سے لپٹا رو رہا تھا۔

اُسی لمحے کھانستے کھانستے فاطمہ لیٹے ہوئے سے اٹھی، تو ایک نرس نے جلدی سے سٹیل کا پلیٹ نما برتن اُسکے سامنے کیا۔ اور اُس لمحے علی سفیر کے قدموں کے نیچے سے دنیا سرکی تھی۔

اُس نے دیکھا تھا، اُسکی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ فاطمہ آفندی نے اُس برتن میں خون تھوکا تھا۔ نرس نے اُسکے منہ پر رومال رکھا اور اُسے دوبارہ لٹا دیا۔ اُس نے اتنی گہری سانس لی جیسے کب سے سانس رکی ہوئی ہو۔ پھر دوسری نرس نے اُسکی ناک میں آکسیجن کی نلکی لگا دی۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اُس لمحے علی سفیر کو یاد نہ رہا کہ سامنے لیٹی عورت سے وہ شدید نفرت کا دعویدار ہے۔

''فاطمہ!۔۔۔۔ فاطمہ۔۔۔۔ کیا ہوا ہے اِسے۔'' وہ تیزی سے وہاں آیا۔ پر فاطمہ نہ کچھ کہنے نہ کچھ سننے کے لائق تھی۔ اُسکی حالت اتنی بدتر ہو رہی تھی کہ وہ بس کھانسی روکنے کی تگ و دو میں تھی۔ علی کی گود میں نشمیہ بری طرح رو رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے اسے۔'' اِس سے پہلے کہ وہ ڈاکٹر کو جھنجھوڑ دیتا سفیر صاحب نے اُسکا بازو پکڑ لیا۔ وہ جھٹکے سے مڑا اور اگلے ہی لمحے اُنکے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر وہ جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آیا تھا۔

وہ تو اُسکی مطلقہ تھی نہ؟

اُسکو دھوکا دینے والی عورت؟

----------+---------+--------

''چلو اُٹھو! یہ سامان کچن میں رکھ کر آؤ!'' رضا نے میز پر پھیلے سامان کی جانب اشارہ کرتے، آڑھے ترچھے لیٹے حسین کو کہا۔

''میں بیمار ہوں۔'' اُس نے ہری جھنڈی دکھانی چاہی۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ اُٹھو اور تھوڑا چلو پھرو۔'' رضا نے اُسے زبردستی بازو سے پکڑ کر اُٹھایا تو وہ برے برے منہ بناتا، سامان لیکر کچن کی جانب بڑھا۔ اوپن کچن سامنے ہی تھا۔ حسین سامان رکھنے لگا۔

''حور عین دیکھ لے مجھے ایسے کام کرتے ہوئے۔ یقین مانو! تمہاری بلائیں ہی لے لے گی۔'' اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ایک کام کرو! سامان کچرے کے ڈبے میں ڈال دو۔ ایسے سلیب پر ہی پڑا مت چھوڑ دینا۔'' رضا نے خاصی سنجیدگی سے حکم دیا تھا۔

''بات سنو!'' وہ تیوری پر بل چڑھائے، سامان چھوڑ کر واپس سے اُسکے سامنے آیا اور ناراضگی سے اُس ے دیکھا۔ ''اگر تمہاری محبت میں، میں تمہارے ساتھ آگیا ہوں نا! تو اِسکا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ تم مجھے ملازم سمجھ لو۔ اُٹھو اور جا کر چائے بناؤ! بہت آرام کر لیا تم نے کل سے اور بہت خوار کروالیا تم نے کل سے ہمیں۔'' وہ مقدم کے برابر صوفے پر ڈھیتے ہوئے بولا۔

''گیس نہیں ہوتی اِس وقت شہر میں۔'' اُس نے یاد دلایا۔

''تمہارے پاس الیکٹرک کیٹل ہے۔ تم نے اُسی میں پچھلی بار چائے پلائی تھی مجھے۔ تمہیں معلوم ہے نہ تمہاری ہاتھوں کی چائے مجھے کتنی پسند ہے؟ چلو اُٹھو شاباش!'' اُس نے شرارت سے کہا۔ وہ جب بھی رضا کا بن بلایا مہمان ہوا تھا، ہمیشہ اُس سے زبردستی چائے ضرور بنوائی تھی۔ وہ برے برے منہ بناتا کچن کی جانب آیا۔ جانتا تھا اُس سے بحث کا کوئی حاصل حصول نہ تھا۔

''یہ دوبارہ کچھ غلط تو نہیں کریگا۔'' کاؤنٹر پر کھڑے رضا کی پیٹھ پر نظریں جمائے مقدّم نے سرگوشی کے سے انداز میں حسین سے پوچھا۔

''جس رات صنوبر اغوا ہوئی تھی۔ اُس رات تم مجھ سے رضا کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔'' حسین نے بڑی ہی غیر متوقع بات کہی۔

''ہاں! اور تم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔'' اُسکا شکوہ بجا تھا۔

''کاش! میں بتادیتا۔ میری غلطی تھی کہ میں نے سوچا کہ اگر سب کو بتادوں گا تو رضا کے ساتھ خیانت ہو گی۔ میں اکیلے ہی سارا معاملہ سنبھال سکتا ہوں۔ لیکن میں غلط تھا۔ اگر سب کو معلوم ہوتا تو سب مل کر اُسے سنبھال لیتے۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔

''میں عمر کے بارے میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اگر وہ یہاں سے بھاگنے کے بجائے، سب کو بتادیتا تو شاید ہم سب مل کر، اُسکو غلط فیصلہ لینے سے روک پاتے۔'' اُس نے افسوس سے کہا۔

''عمر؟'' حسین حیران ہوا۔ ''کیا تم نے عمر سے پوچھا؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''ہاں! میں نے اُسے بتایا کہ تم خضر سے ملے تھے۔'' اُس نے سرگوشی نما انداز میں کہا۔

''اگر اب میرے کانوں تک سرگوشیوں کی آواز آئی، تو میں دونوں کو گھر سے نکال دوں گا۔ انسانوں کی زبان میں بات کرو۔'' یکدم ہی رضا کی بلند آواز لاؤنج میں گونجی تھی۔

''اوہو! کوئی ہماری آواز سننے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے؟'' حسین کیوں باز آتا؟

''محفل کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔'' رضا نے بھی کس کو غیرت دلانی چاہی تھی؟

''غیبت کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ جسکی کی جا رہی ہو، اُس تک نہیں پہنچنی چاہیے ورنہ وہ غیبت کیسے ہو گی؟'' اُس نے بھی دو بدو جواب دیا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' اپنا تکیہ کلام دہراتے اُس نے میز پر چائے رکھی تو دونوں اُسکے انداز پر ہنس پڑے۔

''تم عمر کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟'' حسین نے ایک بار پھر سے سنجیدہ ہوتے ہوئے مقدّم سے پوچھا۔ سامنے صوفے پر بیٹھتے رضا نے بھی دیکھا۔

''عمر کو ٹیومر ہو گیا تھا، اور۔۔۔'' اُسکے بعد وہ سب بتاتا چلا گیا۔ اُنکے لیے ہر شے پہلے سے زیادہ ناقابلِ یقین سی تھی۔

''خضر؟ خضر کا انتقال ہو گیا؟'' حسین کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''کاش! اُس وقت ہم ایک دوسرے سے اپنے معاملات ڈسکس کر لیتے۔'' مقدّم نے آہستہ سے کہا۔

''ہم سب اِس وقت ریگریٹ (پچھتاوے) سے گزر رہے ہیں۔ پہلے ہم ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے۔ اب سب کو لگ رہا ہے کہ وہ ہی جھگڑے کا سبب تھا۔'' حسین نے اُسکا دکھ بانٹنا چاہا۔

''میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ سینے سے غم لگا کر پھرنے سے اچھا تھا، اپنے دوستوں کو سب بتا ہی دیتا۔ لیکن نجانے ہم سب کو اچانک سے کیا ہو گیا تھا؟'' مقدّم نے اُداسی سے کہا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب ہم اُسے ماضی میں جا کر بدل نہیں سکتے۔'' حسین نے نرمی سے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہاں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

''مقدّم!'' مقدّم موبائل میں کچھ دیکھنے لگا ہی تھا کہ کافی دیر سے خاموش رضا نے یکدم ہی اُسے مخاطب کیا۔

''ہمم!'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔''اُس نے جھجھکتے ہوئے بات کا آغاز کرنا چاہا۔

''لیلیٰ اغوا ہوگئی تھی،اِس لیے مجھے آناًفاناً سوات کے لیے نکلنا پڑا تھا۔''رضا کے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے اُس موبائل رکھتے ہوئے سنجید گی سے کہا۔وہ جان گیا تھا کہ رضا کیا پوچھنا چاہتا ہے۔

''اغوا ہو گئی تھی یعنی ؟''حسین نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''ہاں !اُسے ،اُسکے بھائی نے اغوا کر لیا تھا، پھر قتل کر دیا تھا۔بس !اُسکے بعد جو ہوا وہ تو تمہیں معلوم ہے۔''اُس نے اُداس سی مسکان کے ساتھ کہا۔

''پر کیوں ؟''رضا نے پوچھا۔

''قبائلی عصبیت۔۔۔''اُس نے کندھے اُچکائے۔لیلیٰ کا ذکر آج بھی دل چیرنے پر قادر تھا۔وہ لوگ خاموش ہوئے۔

''چاند تو نکلا نہیں !آخری روزہ میں سکون سے گھر میں افطار کرنا چاہتا ہوں۔ برائے مہربانی کل کوئی اور چاند مت چڑھا دینا تم لوگ۔'' حسین نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔در حقیقت موضوع بدلا تھا۔

''اگر تم سکون سے گھر چلے جاؤ!تو یقین مانو تم صرف افطاری ہی نہیں بلکہ سحری بھی گھر پر ہی کروگے۔''رضا نے خاصی سنجید گی سے مشورہ دیا تھا۔

''دیکھ رہے ہو اسے ؟کیسے ہمیں گھر سے نکالنے پر تلا بیٹھا ہے۔''حسین نے مصنوئی دکھ سے مقدّم کو کہا تھا۔

''ہمیں نہیں، صرف تمہیں۔۔۔''مقدّم نے تصحیح کی تھی۔

''یقین مانو !اب تو حور بھی شک کرنے لگی ہے مجھ پر، کہ میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہوتا ہوں۔''اب کہ اُس نے بیچارگی سے کہا تو دونوں ہنس دیئے تھے۔

----------+---------+--------

''یہ کافی عرصے سے پلمونری ٹی بی کا شکار ہے، جس نے اِسکے پھیپھڑوں پر اثر ڈالا ہے۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے ٹھیک سے علاج نہیں کرواسکی۔ مرض اب بگڑ گیا ہے۔''لیونگ روم میں اِس وقت فقط تین نفوس موجود تھے۔آواز صرف سفیر صاحب کی تھی یا پھر علی کی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کی۔ نشمیہ کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی کہ وہ علی کی گود میں سر رکھ کر صوفے پر ہی سوئی ہوئی تھی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے اُسکا سر سہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فاطمہ دواؤں کے زیرِ اثر اب پر سکون ہو کر سو چکی تھی، جبکہ احمد اب تک اپنی ماں کے سرہانے بیٹھا تھا۔

''اُسکی طبیعت تین روز سے کافی زیادہ خراب تھی، میں نے اُسے منع بھی کیا تھا کہ آج اسکول نہ جائے لیکن آج اُسکی تنخواہ کا چیک آنا تھا۔ خراب طبیعت میں بھی وہ چلی گئی۔''

میں جاب وغیرہ نہیں کروں گی، ٹھیک ہے؟ مطلب میرا ماننا یہ ہے کہ جب اللہ نے مرد کو میرا کفیل بنایا ہے تو میں کیوں بلاوجہ کا بوجھ اپنے سر لوں؟ میں ایک گھریلو قسم کی لڑکی ہوں۔

ایک زندہ دل لڑکی کا چہکتا لہجہ اُسکی سماعتوں میں گونجا۔ یاداشت کے کسی کونے نے جیسے اب جاگنا شروع کیا تھا۔

''علاج ممکن ہے اُسکا لیکن۔۔۔''سفیر صاحب رکے۔

''لیکن؟''اُس نے پہلی بار چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔

''اُس کے اندر سے جینے کی امنگ ختم ہو چکی ہے۔ قوت مدافعت بھی کمزور ہو چکی ہے، وہ تنہائی کا شکار ہے۔اِس لیے وہ اپنے دونوں بچوں کو تمہارے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ اُس روز بھی وہ صرف نشمیہ کو تمہیں لوٹانے اور احمد کو آخری بار دیکھنے آئی تھی لیکن شاید تمہیں سمجھا نہ سکی۔''اُنہوں نے آہستہ سے کہا۔ علی نے کچھ نہ سنا۔۔۔ علی سفیر نے واقعی کچھ نہ سنا، اُس کی دنیا بس لفظ **آخری بار** پر ہی رک گئی تھی۔ اُس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

پتہ نہیں! زندگی دوبارہ موقع دے یا نہ دے؟ پر مجھے تم سے معافی مانگنی ہے۔

تو وہ اس لیے ایسا کہہ رہی تھی؟ اُسے اپنے زندہ رہنے کی کوئی اُمید تھی نہ چاہ۔

''اُس نے اپنا علاج روک دیا تھا۔ پہلے وہ جو کماتی تھی، اُس سے ہاسٹل کا کرایہ، کھانا پینا اور اپنی دوائیں خرید اکرتی تھی۔ پر اب دو ماہ سے اُسے احمد کا خرچہ بھی اُٹھانا پڑ رہا تھا۔ تو اُس نے اپنی دوائیں روک دی تھیں۔'' زندگی میں ایسے کتنے ہی لمحات آئے تھے، جب اسکا دل کیا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اُس میں سما جائے۔ آج بھی ایسا ہی ایک اور لمحہ، علی سفیر کا مقدر ہوا تھا۔ وہ اپنے کیے پر بعد میں پچھتاتا تھا، سو اب وہی کر سکتا تھا۔

''ابّا! آپ احمد کا خرچہ بھیج دیتے۔ آپ کا تو رابطہ تھا نہ!'' اُس نے ٹوٹے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ احمد کو اُسکی ماں کے ساتھ بھیج کر علی نے اُس سے تمام تعلقات ختم کر لیے تھے، حتیٰ کہ اُسکے اخراجات دینا بھی بند کر دیئے تھے۔ یہ سوچے بنا کہ اُسکا بیٹا کیسے رہ رہا ہو گا؟

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا؟'' اُنہوں نے اُسے دیکھا۔ ''میں نے فاطمہ سے رابطہ کیا تھا تا کہ اُسکے اکاؤنٹ میں پیسے بھیج سکوں۔ پر اُس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کسی قسم کی کوئی رقم یا مدد مجھ سے نہیں لینا چاہتی تھی۔ جب نشمیہ اُسکے پاس تھی، تب وہ اپنے باپ کے گھر میں رہ رہی تھی اور نشمیہ کا سارا خرچہ اُسکے نانا اُٹھاتے تھے۔ اور ظاہر ہے، جو احسان کرتا ہے وہ جتاتا بھی ہے۔'' اُنہوں نے کہا تو علی نے بیساختہ اپنی گود میں سوئی نشمیہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اب اُسے معاف کر دو، معاف کر دو کہ کم از کم وہ سکون سے مر سکے۔

سفیر صاحب کے الفاظ یاد آئے تو انہیں دیکھا۔

''ابّا!'' اُس نے پکارا۔

''ہونہہ؟'' اُنہوں نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''کیا۔۔۔ کیا وہ۔۔۔ مر جائے گی؟'' اُس نے کیسے پوچھا تھا وہ ہی جانتا تھا۔

''اگر علاج ہو جائے گا، تو ہرگز نہیں!'' اُنہوں نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو اُسکا علاج کروانا ہو گا۔'' اُس نے یکدم ہی کہا۔

''کون کروائے گا؟'' اب وہ عجیب سے انداز میں اُسے دیکھ رہے تھے۔

''ہم۔۔۔ہم کروائیں گے۔''

''تو کیا تم اُس عورت کا علاج کرواؤ گے جس نے تمہیں دھوکا دیا؟ اور کیا وہ ایسے آدمی کا اپنے علاج کے اخراجات اُٹھانا قبول کریگی، جو اُسکا سابقہ شوہر ہے؟'' نہیں! وہ طنز نہیں کر رہے تھے۔ وہ سوال کر رہے تھے۔ وہ واقعی جاننا چاہتے تھے کہ علی کیا ایسا کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟ اور علی سفیر اِس بات کے جواب میں خاموش رہ گیا۔

''خیر! میں اِسکے گھر والوں سے بات کرتا ہوں۔ جو بھی ہو جائے، فاطمہ اِنکی اولاد ہے۔ اُسکی حالت کے بارے میں جاننا انکا حق ہے۔ اور فرض بھی!'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ایک نظر علی کو دیکھا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

علی نے آہستہ سے نشمیہ کو گود میں اٹھایا اور اپنے کمرے میں لا کر لٹا دیا۔ جب سے فاطمہ آئی تھی، وہ اپنی مرضی سے جہاں دل کرتا وہاں سو جاتی۔ کبھی فاطمہ کے پاس تو کبھی اپنے بھائی احمد کے ساتھ تو کبھی علی کے ساتھ۔ وہ ویسے بھی اپنی مرضی کی مالک تھی۔ علی نے مسکرا کر اُسکا سر سہلایا، پھر اسے سوتا چھوڑ کر باہر آ گیا۔

کمرے سے باہر آ کر ایک نظر سفیر صاحب کے بند کمرے کی جانب دیکھا، اور پھر اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب۔ پھر خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ فاطمہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ احمد اُسکے سرہانے سر رکھے سو گیا تھا، خود وہ اب تک دواؤں کے زیرِ اثر تھی۔ علی آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا اور احمد کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ایک نظر فاطمہ پر ڈالی، اور وہ ایک نظر دھندلا گئی۔

اُسکے سفید دوپٹے پر خون کے دھبّے ابھی بھی موجود تھے۔ بند آنکھوں کے باوجود حلقے واضح نظر آ رہے تھے، چہرہ ہلدی جیسا پیلا ہو رہا تھا، جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ یہ وہ فاطمہ تو نہیں تھی جو اُسے چھوڑ کر گئی تھی۔

اُسکا سابقہ شوہر ایک اسمگلر، شرابی اور جواری تھا۔ اُسے مارتا تھا، پیٹتا تھا۔

کیا حال کر دیا تھا اُس بدبخت نے اِسکا؟ علی نے نظریں جھکا دیں۔ پھر احمد کے سر پر ہاتھ رکھا، وہ نیند کا کچا تھا۔ فوراً گھبرا کر آنکھ کھولی تو علی نے اشارے سے اُسے پر سکون رہنے کو کہا۔

''چلو بیٹا! اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔'' اُس نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔

''نہیں!''اُس نے نفی میں سر ہلایا۔''میں امی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''اُس نے حتمی انداز میں کہا پھر علی کے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں سے آہستگی سے ہٹائے۔

''آپ سو جائیں، آپ کو آفس جانا ہے۔ میں اپنی امی کا خیال رکھ سکتا ہوں۔''اُس نے بد تمیزی نہیں کی، پر بہت ادب سے واضح کر دیا کہ اُسکے لیے کون زیادہ اہم ہے؟ علی نے بس نرمی سے مسکرا کر سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

باہر آ کر وہ رکا اور پلٹ کر ایک نظر پھر کمرے میں دیکھا۔ احمد دوبارہ فاطمہ کے سرہانے پر سر رکھ چکا تھا۔ باپ کے ہاتھوں کو خود سے دور کر کے، اپنی ماں کے سرہانے بے آرام ہونے والے، اِس بچے نے ایک لمحے کو اُسکے قدم منجمد کر دیئے۔

رضا الٰہی۔۔۔ کیا یہ رضا الٰہی کا بچپن تھا؟ کیا علی سفیر معاشرے کو ایک اور رضا دینے والا تھا؟ کیا وہ اپنے گھر میں رضا جیسے ایک اور بچے کا بچپن برباد کر رہا تھا؟

کہیں علی سفیر بھی وہ ظالم باپ تو نہیں تھا؟

کہیں۔۔۔ کہیں واصف الٰہی کی طرح۔۔۔ اُسکے حصّے میں بھی اولاد کی نفرت تو نہیں آ رہی تھی؟

اور اِس ایک سوال نے علی کی روح تک فنا کر دی تھی۔

----------+---------+--------

''بارہ بج گئے؟''صبح آنکھ کھلتے ہی اُس نے آنکھیں مل کر وقت دیکھا تو چیخ اُٹھی۔

''میں اتنی دیر تک کیسے سو گئی؟''تیزی سے اُٹھ کر پیروں میں چپلیں ڈالیں اور کمرے سے باہر آئی۔ کچن سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ حیران سی کچن کاؤنٹر کے پاس آئی تو اندر کا منظر دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ گئی۔

سیاہ ٹراؤزر پر، سیاہ ٹی شرٹ پہنے۔ اُس پر نیلی جینز کے کپڑے کا ایپرن ڈالے، نوید کاؤنٹر پر کھڑا سبزیاں کاٹ رہا تھا۔ سرمئی و سفید امتزاج کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور بھی دیگر سامان جیسے مسالے، ساوسز وغیرہ آس پاس رکھے تھے۔ پھر بھی کچن میں کوئی گندگی نہ تھی۔ وہ اپنا کام نفاست سے کرنے کا عادی تھا۔ چہرے پر ازلی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''اُٹھ گئیں آپ؟'' گرائنڈر میں سبزیاں ڈال کر اُنہیں چھوٹا کرنے کی غرض سے سلیب کے پاس جاتے ہوئے نوید نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

''تم گھر کب آئے؟'' اُس نے بھی ایس ایس پی نوید عالم کی بیوی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

''سحری سے پہلے آگیا تھا۔'' اُس نے کہا۔

''تو مجھے کیوں نہیں اُٹھایا سحری میں؟ میرا روزہ رہ گیا۔'' وہ ناراض ہوئی تو پہلی بار اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ بشریٰ خوش قسمت تھی، جو دن میں کئی بار اُسے مسکراتا ہوا دیکھتی تھی۔

''تم نے کل روزہ رکھا تھا، آج آرام کرو۔ تم جانتی ہو ابھی ڈاکٹر نے تمہیں دواؤں میں ناغہ کرنے سے منع کیا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''اتنے روزے قضاء ہو رہے ہیں میرے۔'' اُس نے افسوس سے کہا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر تھی اب۔

''بلا عذر تو قضاء نہیں ہو رہے۔'' وہ پھر مُسکرایا، اور سبزیاں نکالتے کاؤنٹر پر آگیا۔ اب وہ اور بشریٰ آمنے سامنے تھے۔ درمیان میں کاؤنٹر تھا۔

''تم کیا کر رہے ہو صبح صبح کچن میں؟'' اُس نے پوچھا۔

''افطاری بنا رہا ہوں۔ میری چھٹی ہے آج، اور کل عید ہے۔ تو بس آج تمہیں اپنے ہاتھوں کی بنی افطاری کرواؤں گا۔'' اُس نے دونوں ہتھیلی کاؤنٹر پر جماتے، اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ہاتھوں کی رگیں تن کر اُبھری تھیں۔

''افطار میں بہت وقت پڑا ہے ایس ایس پی صاحب!'' اُس نے بھی سینے پر بازو باندھتے جتایا تو وہ چہرہ نیچے کرتے ہنسا (چشم بدور!)۔ اُس کا ہر انداز نوید کو پیارا تھا۔

''میں ایک نہایت ہی غیر پیشہ ورانہ قسم کا باورچی ہوں، تو مجھے کام کرنے میں اتنا ہی وقت درکار ہوگا۔'' اُس نے کھلے دل سے تسلیم کیا۔

''تم رات کو کہاں تھے؟'' اُس نے یکدم ہی پوچھا تو اب کہ وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔ اللہ نظر نہ لگائے ایس ایس پی صاحب کو! ہنستے ہوئے پیارے لگتے تھے بہت۔

"تم خالص ایک پولیس والے کی بیوی ہی لگ رہی ہو اِس وقت۔" اُس نے کچن سے باہر آکر اُسکے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بات نہیں بدلو!" وہ خفا ہوئی۔

"ڈیوٹی تھی بشریٰ!" اُس نے بتایا۔

"جلدی آیا کرو نانوید! مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔" اُس نے کہا تو نوید نے چند لمحوں اُسے دیکھا۔ ہاں! وہ اب واقعی اکیلی تھی، اُسکے بچے اب اُسکے ساتھ نہیں تھے۔

"افطار کے بعد باہر چلیں گے۔" اُس نے بشریٰ کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟ اور کس لیے؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہیں مہندی لگوانے۔" اُس نے کہا۔ اللہ اللہ! ایس ایس پی صاحب اور اُن کے شوق!

"نہیں بھئی! چاند رات کو بہت رش ہوتا ہے۔" اُس نے منہ بنایا۔

"کوئی نہیں! ہم تمہارے لیے پہلے ہی مہندی آرٹسٹ بک کر چکے ہیں۔ تم نے بس جانا ہے اور لگوا کر واپس آجانا ہے۔"

"پر نوید۔۔۔" وہ زچ ہوئی۔

"چلو جا کر آرام کرو! مجھے بہت کام ہیں ابھی۔ تمہارا ناشتا بھی لیکر آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔" وہ اُسے باہر چھوڑتا واپس کچن میں آگیا جو اِس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ اپنی بات منوا کر ہی رہے گا۔ بشریٰ بس مسکرا دی۔

----------+---------+--------

عمر جلدی جلدی لیپ ٹاپ پر اُنگلیاں چلا رہا تھا۔ آفس میں بھی آج بہت گہما گہمی سی تھی۔ کل عید تھی اور پھر چار روز کی چھٹی تھی۔ ہر کوئی جلد از جلد اپنا کام نمٹانا چاہتا تھا۔ وہ بھی بس اپنے آخری آخری فرنیچر ماڈل کی نوک پلک سنوار رہا تھا۔ اُسکے بر عکس علی کا انداز آج بہت سست سا تھا۔ اِسکے علاوہ وہ خاموش بھی بہت تھا۔ عمر بھی کام کے باعث اُس سے صحیح سے بات نہیں کر سکا۔ وہ آج سٹوڈیو بھی نہیں آیا تھا۔

خاموشی سے اپنے آفس میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ عمر نے اپنا کام ختم کیا اور کچھ سوچ کر اُسکے آفس کے باہر آیا۔ اندر علی ابھی بھی کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ عمر نے دروازہ بجایا تو اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"آجاؤ عمر!" اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اندر آ گیا۔

"تمہارا کام مکمل ہو گیا؟" اُس نے علی کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار! تھوڑا رہتا ہے۔ سوچ رہا ہوں عید کے بعد ہی مکمل کروں۔" اُس نے گردن پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"نوید نے زیادہ کلاس لے لی تمہاری؟" عمر نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

"نہیں! پوچھ رہا تھا کہ تمھارے پاس اُسکے گھر کا ایڈریس کہاں سے آیا؟" علی نے ازراہ مذاق کہا۔

"میں تو سمجھا وہ اپنے پرانے والے گھر میں رہتا ہے، اِس لیے پیشکش کر دی تھی۔ وہ تو جب اُس نے پوچھا کہ مجھے اُسکا گھر کیسے معلوم تو جو منہ میں آیا بول دیا۔" اُس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"خیر ہے! اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اُس سے۔" "نہیں نہیں! وہ آدم خور ہر گز نہیں ہے۔

"چلو پھر تم کام کرو!" وہ کہہ کر اُٹھنے ہی لگا تھا۔

"عمر!" علی نے اُسے اچانک ہی پکارا تو وہ رکا۔

"ہاں؟" سوالیہ نظروں سے کسی گہری سوچ میں مبتلا علی کو دیکھا۔

"اگر کسی شخص نے آپکو بہت شدید قسم کا دھوکا دیا ہو، اور اب وہ شرمندہ ہو۔ اپنے کیے پر نادم بھی ہو، تو کیا اُس پر دوبارہ بھروسہ کرنا چاہیے؟" عمر نہیں جانتا تھا کہ اُس نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟ پر اُسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اپنے دوست کی مشکل حل کرنا اُس پر فرض ہے۔

"نہیں! دوبارہ بھروسہ کرنا بیوقوفی ہے۔ لیکن۔۔۔" وہ کہتے ہوئے دوبارہ بیٹھا۔

"لیکن؟"

''لیکن اگر وہ اپنے کیے پر نادم ہے، تو اُسے ایک موقع دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''پر معاف کرنا آسان تو نہیں ہے''، علی نے کہا تو اُس نے گہری سانس بھر کر پیچھے ٹیک لگائی۔

''میں نے کب کہا معاف کرو؟ پر موقع تو دو۔ دیکھو! ایک ایسا شخص جو اپنے کیے کا برا نتیجہ بھگت چکا ہو، جس نے آپکو دھوکا دے کر نقصان اُٹھالیا ہو، وہ دوبارہ یہ غلطی نہیں کرے گا۔ جسے ایک بار قدر آجائے وہ دوبارہ ناقدری نہیں کرتا۔ میرے نزدیک تو ٹھوکر کھا کر سنبھلا ہوا انسان زیادہ قابلِ بھروسہ ہے۔ کیونکہ اب وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے گا۔ لیکن اگر پھر بھی بھروسہ نہ کرو تو کم از کم ایک موقع دو۔ ہم سب اپنی غلطیوں کے لیے ایک نہیں کئی کئی بار مواقع چاہتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے نہیں! تم نہیں جانتے علی! غلطی کرنے والا صرف ایک موقعے کے لیے کتنا ترستا ہے؟'' آخر میں اسکے لہجے میں کچھ ٹوٹا تھا۔ علی نے غور ضرور کیا پر کچھ کہا نہیں۔

فلحال وہ کسی گہری سوچ میں تھا، اور وہ کیا سوچ رہا تھا؟ وہ ہی جانتا تھا؟

----------+---------+--------

جزا خاموش نظروں سے اِس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ رضاالٰہی واپس آ گیا تھا۔ پناہ گاہ کی رونقیں بھی لوٹ آئی تھیں۔ بچے اُس سے چمٹے ہوئے تھے، اور وہ ہر بچے کا شکوہ سنتے اُس سے معذرت کر رہا تھا۔ ہر ایک کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔

جزا نے مسکرا کر دیکھا اور قریب آئی، وہ پنجوں کے بل بیٹھا بچوں کے گلے لگ رہا تھا۔ پرسوں رات سے وہ بہت پریشان تھے۔ اُس نے چہرہ اٹھا کر جزا کو دیکھا پھر کھڑا ہوا۔

''تم نے بچوں کا بہت خیال رکھا۔ تمہیں اب گھر جانا چاہیے۔''اُس نے سنجیدہ سے چہرے کے ساتھ کہا تو جزا کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ یہی کہنا تھا اُسے؟ اُس نے غور سے دیکھا، رضا نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ وہ کیوں چھپ رہا تھا؟ اور کس سے؟ بھلا اِس سب میں اُسکا کیا قصور تھا؟ بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر اِس میں جزا کا کیا قصور تھا؟

''ہاں! مجھے بہت کام ہیں۔''اُس نے جتاتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل گئی۔ رضا اُسکے انداز پر حیران رہ گیا۔ اسے اُمید نہ تھی کی وہ واقعی ایسے چلی جائے گی۔

''ایسا ہی کرنا چاہیے تھا اُسے میرے ساتھ، میری حقیقت جو معلوم ہو گئی ہے اُسے۔ بھلا اب میں کہاں اُسکے قابل رہا ہوں گا؟'' رضا نے دکھ کی کیفیت میں سوچا تھا۔

غلط فہمی یہاں بھی تھی۔

اور غلط فہمی وہاں بھی تھی۔

کہاں تھی تم جب تمہارا بھائی گلیوں میں اپنے مرے ہوئے بچوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا؟ جب وہ اُنہیں آوازیں دے رہا تھا؟ کہاں تھی تم جب اُسکی بیوی نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تھا؟ کہاں تھی تم جب وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا؟ اُسکی آواز، اُسکی چیخیں میرا کلیجہ پھاڑ رہی تھیں جزا!

اپنے گھر آ کر بستر پر ڈھنے کے سے انداز میں لیٹی جزا کو وحید کے الفاظ یاد آئے۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو جھرنوں کی طرح بہنے لگے تھے۔

اتنا سا بھی احساس نہیں ہوا؟ اتنی نفرت جزا؟ اتنی؟ صرف ایک اینٹوں سے بنے گھر کے لیے؟

یہ اینٹوں سے بنے گھر کے لیے نہیں تھا بھائی! یہ نفرت نہیں تھی۔ کاش! آپ مجھے بھی بولنے کا موقع دیتے۔

میں تمہاری خود غرضی، خود پرستی اور سنگ دلی سے تنگ آ چکا ہوں۔ کیا تمہارے دل میں اپنے بھتیجوں کے لیے ذرا سی محبت نہیں تھی؟ کیا تمہیں اُنکی موت کا ذرا دکھ نہیں ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ نوید کے بچے تھے۔

غلط فہمی یہاں بھی تھی۔۔۔

ہر جانب تھی۔۔۔۔

وہ کس کس کا دل صاف کرتی؟

اور کیسے؟

----------+---------+--------

افطار کے بعد سے باہر ہر جانب گہما گہمی شروع ہوگئی تھی۔اِس ملک میں چاند رات ایک الگ ہی تہوار ہوتا تھا۔ بازار سج گئے تھے، سڑکیں اپنی رونقوں کے قصے سنائے دیتی تھیں، عورتیں بچیاں رنگوں سے دنیا سجا رہی تھیں۔

ایسے میں اُسکے گھر میں ہر طرف گہرا سکوت سا چھایا ہوا تھا۔اُسکے اندر بھی، اور اُسکے باہر بھی۔ عمر سے بات کر کے وہ گھر آیا تو خاموش ہی رہا۔افطار کے وقت بھی ایک جامد خاموشی چھائی رہی۔یوں بھی اُس نے افطار اکیلے ہی کی تھی۔ سفیر صاحب، احمد اور نشمیہ، فاطمہ کے پاس اُسکے کمرے میں تھے۔ فاطمہ کی اُسے کوئی خبر نہ تھی۔ کل کے بعد سے اُس نے اب تک اُسے نہ دیکھا تھا۔افطار کر کے وہ چپ چاپ سا لیونگ روم کے صوفے پر آبیٹھا تھا۔اور اب اُسے وہاں بیٹھے گھنٹہ گزر چکا تھا۔ذہن نجانے کہاں بھٹکا ہوا تھا؟

''آپ کیا کر رہے ہیں؟'' ہمیشہ کی طرح نشمیہ اُسکے کانوں کے پاس آکر چلائی تھی۔ پر اب وہ دہل کر نہیں دیکھتا تھا، اُسے عادت ہوگئی تھی اِس پٹاخے کی۔

''کچھ نہیں!'' اُس نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''آپ کو مہندی لگاؤں؟'' اُس نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا، تو علی نے حیرت سے اُسے دیکھا، اُسکے ہاتھ میں مہندی کی کون تھی۔

''یہ کہاں سے آئی؟'' وہ حیران ہوا۔

''ابّا نے لا کر دی۔'' اُس نے بتایا۔

''تمہیں لگوانی ہے؟'' علی نے اُسے گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! مجھے کسی کو لگانی ہے۔'' وہ نشمیہ تھی، وہ کیوں سیدھے کام کرتی؟ علی ہنسا۔

''میں نے ابّا کو کہا، اُنہوں نے منع کر دیا، پھر بھائی کو کہا اُس نے بھی منع کر دیا۔امی بھی بیمار ہیں نا! تو وہ بھی نہیں لگائیں گی۔ میں کیا کروں؟'' اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ہمیشہ کی طرح اُسکے ہزار مسائل۔

''چلو تم میرے ہاتھ پر لگا دو۔'' اُس نے ہنستے ہوئے ہتھیلی آگے کر دی۔

''سچی؟'' اُس نے ننھی ننھی آنکھیں وا کرتے ہوئے، اُس سے تصدیق چاہی۔

''ہاں!''اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ خوش ہو گئی۔ پھر اُس نے دل بھر کے علی کے ہاتھوں پر نقش و نگار بنائے، اُس نے بھی ماتھے پر ایک شکن بھی لائے بنا اپنے ہاتھوں کو گندا ہونے دیا۔ جب اُسکا دل بھر گیا تو خود ہی مہندی کی کون رکھ کر اپنے لیے کوئی اور دلچسپی ڈھونڈلی۔ علی نے سامنے رکھا وائپ اٹھایا، اور اُس سے ہتھیلی صاف کرنے لگا۔ مہندی پرانی نہیں ہوئی تھی، پھر بھی اُسکی ہتھیلی پر رنگ آگیا تھا۔ عجیب و غریب قسم کی چیزیں اُسکی ہتھیلی پر لگا کر وہ یقیناً بہت خوش تھی، وہ خوش تھی تو علی کو اور کیا چاہیے؟

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میری بھی ایک بیٹی ہوتی، تو شاید میرے مزاج میں اتنی سختی نہ ہوتی۔'' وہ اپنی ہتھیلی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا، جب سفیر صاحب یکدم ہی کہتے ہوئے اُسکے برابر میں آبیٹھے۔ علی نے کچھ نہ کہا، بس خاموشی سے اُنہیں دیکھتا رہا۔

''جانتے ہو علی؟ جیسا میں تھا۔ ویسے ہی میرے اپنے والد صاحب بھی تھے۔ سخت اور جاگیر دار قسم کے۔'' وہ پتہ نہیں آج کیا قصّے لیکر بیٹھ گئے تھے؟

''اُنہوں نے مجھ پر ویسی ہی سختی کی جیسی میں نے تم پر۔ مجھے لگا کہ شاید باپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جلاّد جیسا، اِس لیے شاید میں کبھی شفقت دکھا ہی نہیں سکا۔ مجھے کبھی میری مرضی نہ کرنے دی گئی تو میں نے اپنی مرضی تم پر چلائی۔ میں اپنی زندگی نہ جی سکا تو میں نے تمہاری زندگی کو جینا شروع کر دیا۔ میں اپنے خواب پورے نہ کر سکا تو میں نے اپنے خوابوں کو تم میں دیکھنا شروع کر دیا۔ جب تم نے اُنکے خلاف جانے کی ٹھانی تو مجھے لگا جیسے میرے خواب ایک مرتبہ پھر توڑ دیئے گئے ہیں۔'' علی سن سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اُن باپ بیٹے کے درمیان یہ پہلا موقع تھا، جب وہ اُس سے اپنا کوئی دکھ بانٹ رہے تھے۔

''میں نے غلط کیا۔۔۔ بہت غلط کیا۔ اِس غلطی کا احساس مجھے اُس روز ہوا، جس روز تم فاطمہ سے طلاق لیکر آئے تھے۔ میں پچھتایا علی! پر اُسکے بعد میرے پاس سوائے پچھتانے کے اور کچھ نہ رہا۔ میں چاہتا تھا کہ تم میرے جیسے نہ بنو۔ پر جب تم احمد سے وہی سخت رویہ رکھتے تو مجھے تم میں اپنا آپ، اور میرا اپنا باپ نظر آتا۔ لیکن میں شکر کرتا ہوں کہ تم جلد سمجھ گئے۔ تم نے اِس نسل در نسل چلنے والے ٹراما کو توڑ دیا۔ مجھے فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔'' اُنہوں نے اُسے فخر سے دیکھا تھا۔ اور علی کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو اُتر آئے۔ یہ وہ جملہ تھا جسے سننے کے لیے اُس نے پینتیس سال لگا دیئے۔ جسے سننے کے لیے اُس نے کتنے ہی غلط فیصلے لیے، جس کے لیے کتنے ہی رشتے خراب کیے۔

اُس نے ضبط سے لب بھینچے اور چہرہ جھکا یا۔

''تمہاری زندگی برباد کرنے میں زیادہ ہاتھ میرا ہے۔ مجھے۔۔۔۔یعنی اپنے اِس بوڑھے باپ کو معاف کر دینا۔''انکا لہجہ بھیگا تو علی نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔

''ابّا!''وہ تڑپ کر کھڑا ہوا، پھر اُنکے قدموں میں بیٹھ گیا۔''کیوں مجھے گنہگار کر رہے ہیں؟''اُس نے انکے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے نم لہجے میں کہا۔

''ایسے مت کہیں۔ آپ بہت اچھے باپ ہیں۔ آپ نے مجھے ایک بہترین زندگی دی ہے، بہترین اور قابل انسان بنایا ہے۔ کوئی بات نہیں! بڑوں سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔''اُس نے اپنے باپ کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا۔

''میں شکرادا کرتا ہوں کہ تم نے خود کو یہ غلطی کرنے سے روک لیا۔''اُنہوں نے شاید زندگی میں پہلی بار اُسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اِس میں کمال صرف میری بیٹی کا ہے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ کاش! میری بھی ایک بیٹی ہوتی۔''سفیر صاحب نے کہا۔''بیٹوں پر غصّہ کرنا آسان ہوتا ہے، پر بیٹیوں پر ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔''اُنہوں نے کہا۔

''ذرا نہیں! پورا مشکل۔''اُس نے تصحیح کی تو وہ ہنس دیئے۔

''میں جانتا ہوں کہ جس روز وہ اِس گھر میں آئی تھی، اُس روز آپ جاگ رہے تھے، آپ نے جان کر اُسے کچن میں چھوڑا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ نے جان کر اُسے میرے پاس سونے کے لیے بھیجا تھا، اور یہ بھی کہ آپ اُسکے بال باندھ سکتے تھے۔ پر آپ ایسا صرف اِس لیے کرتے تھے کہ وہ میرے قریب رہ سکے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو سفیر صاحب حیران رہ گئے۔

''میں تو سمجھتا تھا کہ یہ میرا اور میری پوتی کا سیکریٹ (راز) ہے۔''اُنہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''آپ کی پوتی فقط ایک آئس کریم کی لالچ میں سارے راز اُگل دیتی ہے۔''اِس بار وہ دونوں ہنسے تھے۔

''ابّا!''اُسے یکدم ہی کچھ یاد آیا تو فوراً اُٹھ کر اُنکے برابر میں بیٹھا۔

''ہاں؟''اُنہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے۔۔۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔'' اُس نے ذرا جھجھکتے ہوئے کہا تھا۔

----------+---------+--------

''امی! آپ کو پانی دوں؟'' وہ پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، جب احمد نے پوچھا۔

''ہاں! دے دو۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔ کھانس کھانس کر گلا بیٹھ چکا تھا۔

''جی!'' وہ سر ہلاتے کہتا اُٹھا اور پاس رکھے گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔ فاطمہ نے غور سے اُسے دیکھا۔ وہ علی جیسا تھا، بلکہ اُسکا ہی چھوٹا سا ورژن۔ لیکن مزاج میں بہت ٹھہراؤ اور انداز میں بہت سکون ہوتا تھا۔

فاطمہ کے لیےاِس گھر میں آنا بہت اذیت ناک تھا، جس روز اُسے معلوم ہوا کہ اُسے ٹی بی ہے اور وقت گزرنے پر بھی علاج نہ ہونے کے باعث مرض بگڑ چکا ہے۔ اُس روز سے اُسکی فقط ایک ہی خواہش تھی۔ کہ اُسکی بیٹی اپنے باپ کے پاس چلی جائے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے پر وہ پھر بھی علی سے بات کرنے آئی۔ لیکن وہ شدید غلط فہمی کا شکار تھا، اوپر سے احمد نے اپنی ماں کے ساتھ جانے کا کہہ کر معاملہ مزید خراب کر دیا۔ پھر اُسکو وہی کرنا پڑا جو مجبوری تھی۔ پہلے اُس نے نشمیہ کو علی کے پاس بھیجا، پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ علی نے نشمیہ کو نا صرف قبول کر لیا ہے، بلکہ اُسے وہ بہترین زندگی دے رہا ہے جو فاطمہ چاہتی تھی، تو اُس نے احمد کو بھی اُسکے پاس بھیجنے کا سوچا۔ پر اُس سے پہلے ہی علی خود ہی آ گیا۔

اور جب اُس نے احمد اور نشمیہ کو گلے لگایا تو فاطمہ کو لگا کہ اُسکا کام مکمل ہو گیا۔ اُسکے دونوں بچوں کو انکا گھر مل جائے، باپ کا پیار مل جائے، معاشرے میں ایک اچھی زندگی مل جائے، اور اُسے کیا چاہیے؟ ویسے بھی اب اپنے لیے اُسے زندگی سے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ عزتِ نفس، انا، خواب و خواہشات سب مر چکی تھیں۔ وہ احمد کو دیکھ رہی تھی، اُسکے نین نقش دیکھتے ہی دیکھتے علی میں تبدیل ہونے لگے۔ منظر بدل گیا، وہ پارک میں موجود تھی، علی اُسکی دائیں طرف والی بینچ پر تھا اور دونوں کے درمیان کئی لکڑیوں کے تختوں سے بنی میز تھی۔

''بہت سے طلاق یافتہ ماں باپ، اپنے بچوں کا معاملہ کورٹ میں لے جانے کے بجائے آپس میں حل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اُنہیں اپنے بچوں کی ذہنی صحت، اپنی انا سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہے اور یقیناً تمہیں بھی ہو گی۔''اُس روز ویمن ہوسٹل کے پارک میں بیٹھے علی نے اُس سے کہا تھا۔ نشمیہ وہاں موجود بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی، احمد بس بڑے بھائی کی طرح اُس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ دونوں اِس طرح بیٹھے تھے کہ دونوں کی نظریں سامنے اپنے بچوں پر تھیں۔

''میں بچوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتی، اور تم بھی نہیں چاہو گے کہ تمہارے بچے اِس حال میں رہیں۔''فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ باتیں بچے نہیں سمجھتے، وہ تمہارے ساتھ رہنے کی ضد کریں گے۔''اُس نے کہا تو فاطمہ نے چہرہ موڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ اُسکا آدھا چہرہ دیکھ سکتی تھی، دونوں کے درمیان کم از کم بھی تین آدمیوں جتنا فاصلہ تھا۔ یا شاید صدیوں کا!

''میں کبھی کبھار ملنے آسکتی ہوں۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''میرے پاس ایک پیش کش ہے۔ صرف اور صرف میرے بچوں کے لئے۔''اُس نے کافی سرد مہر سے انداز میں کہا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

''پیش کش؟''

''ہاں!''اور پھر علی نے اسے تمام لائحہ عمل بتا دیا۔

''میں نہیں چاہتا کہ بچوں کی پڑھائی، اُنکی ذہنی صحت یا انکا کسی بھی قسم کا کوئی نقصان ہو۔ بہتر ہے کہ تم کہیں قریب ہی رہو، تاکہ وہ تمہیں دیکھ سکیں، تم سے مل سکیں اور میں بھی اُنکی طرف سے بے فکر رہوں۔''اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے! جب تمہارے پڑوس والا گھر خالی ہو جائے، تو میں آجاؤں گی۔''اس نے دوبارہ چہرہ سامنے کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''تم نہیں آؤ گی تو احمد بھی نہیں آئے گا۔ اور میں اب احمد کو اِس حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ عید میں بہت دیر ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی چلو!''اُس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''امی!''احمد نے اُسکا کندھا ہلایا تو وہ واپس حال میں آئی۔ وہ پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

''پانی پی لیں۔''اُس نے کہا۔

''شکریہ بیٹا!''اُس نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھامااور منہ سے لگالیا۔پانی پیتے اُسکی نظریں دروازے پر گئیں اور پتھر ہو گئیں۔ علی سامنے ہی کھڑا تھا، چہرہ سنجیدہ تھا پر نہ نظروں میں آج حقارت تھی، نہ چہرے پر نفرت۔ نجانے وہ کب سے وہاں تھا؟اور کیا سوچ رہا تھا؟ فاطمہ نے احمد کو گلاس واپس دیا۔ علی آہستہ سے قدم اٹھاتے اندر آیا۔اور اُسکے پلنگ کی پائنتی کے پاس کھڑا ہو گیا۔سیاہ ٹراؤزر پر ہلکے سبز رنگ کی پولو ٹی شرٹ پہنے،اُس نے دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ وہ شکل سے کافی مضطرب لگ رہا تھا،اُسکی وہاں آمد کا مقصد فاطمہ کو سمجھ نہ آرہا تھا۔

''احمد!''اُس نے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے، مخاطب احمد کو کیا تھا۔

''جی بابا؟''اُس نے باپ کو دیکھا۔

''تم ابّا کے پاس جاؤ، مجھے تمھاری امی سے کچھ بات کرنی ہے۔''اب کہ علی نے احمد کو سنجیدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔اور اُس نے دیکھا تھا، کہ اِس مطالبے پر احمد کے چہرے پر خوف کے سائے لہرائے تھے۔اُس نے گھبرا کر اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ علی کا دل ڈوبا، وہ دو مرتبہ اپنے باپ کو ماں پر چیختے،اُسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکالتے دیکھ چکا تھا۔اب وہ اپنی ماں کو باپ کے ساتھ اکیلے نہیں چھوڑ سکتا تھا، وہ جیسے فاطمہ کا محافظ تھا۔

''احمد! میں صرف بات کروں گا۔''علی نے نرمی سے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، جیسے اُسکا خوف سمجھ گیا ہو۔ وہ اب بھی نہیں گیا، بلکہ اپنی ماں کو ہی دیکھتا رہا۔اُسے علی پر بالکل بھروسہ نہیں تھا، علی کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔ فاطمہ نے اُسے آنکھوں سے سب ٹھیک ہونے کا اشارہ کیا تو اُس نے چہرہ جھکایا پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ علی کافی دیر سر جھکائے کھڑا رہا اور فاطمہ خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی کہ شاید اب وہ اُسے اپنے آنے کا مقصد بتائے گا۔وہ شاید الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

''میں نے اُس روز تمھیں گھر سے نکالا۔۔۔ تمھیں گالیاں دیں۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ!۔۔۔۔مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''کمرے کی خاموش فضا میں اُسکی آواز گونجی تو فاطمہ کی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت اُتر آئی۔

''مجھے تمھاری بات سننی چاہیے تھی۔مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ میں ایک عورت کے ساتھ ایسا سلوک کر چکا ہوں۔''اُس نے بات مکمل کی۔وہ واقعی فاطمہ کو اس بری طرح گھر سے نکالنے،اور گالیاں دینے پر اب تک شرمندہ تھا۔

''میرے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تم سے پرانے حساب کتاب لوں، اور نہ ہی مجھے اب ایسی کسی بھی شے میں دلچسپی ہے۔ میں بس۔۔۔۔'' بولتے بولتے وہ رکا، پھر گہری سانس لی۔

''میں صرف اپنے بچوں کو اچھی زندگی دینا چاہتا ہوں۔ میں اُنہیں محبت اور عزت والی زندگی دینا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ وہ فکروں سے آزاد بچپن گزاریں اور پر سکون فضا میں پروان چڑھیں۔ میں۔۔۔ میں ایک اور علی کو بڑا نہیں کرنا چاہتا۔'' **اور ایک اور رضا کو بھی۔**

''میں بھی یہی چاہتی ہوں، اِس لیے یہاں آئی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ذہنی سکون میں رہے۔ اِس لیے جتنی بھی زندگی باقی ہے، میں بچوں کے لیے۔۔۔۔''

''فاطمہ!'' علی نے پہلی بار چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ اُسکا نام لیا تھا۔ اور۔۔ اور فاطمہ یہ لہجہ پہچانتی تھی۔ اِس لہجے میں موجود تڑپ کو وہ جانتی تھی، جیسے وہ اُسکی بات مکمل نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ جیسے وہ یہ سب سن نہیں سکتا تھا۔ وہ حیرت زدہ سی اُسے دیکھنے لگی۔ یہ اُسے آج کیا ہوا تھا؟

''میں۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پر کہہ بھی نہ پا رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر گہرا سانس بھر کر خود کو پُر سکون کیا، اور جیبوں سے ہاتھ نکال کر سینے پر باندھ لئے۔ یہ اُسکی شدید اضطرابی حالت کی نشانی تھی۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مہندی کا رنگ نظر آ رہا تھا، عجیب و غریب سے نقش و نگار۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دوبارہ نکاح کر لو۔'' الفاظ ادا ہو گئے۔ سماعتیں بے یقین ہو گئیں۔

''ہاں؟'' فاطمہ کو لگا کہ اُسے سننے میں کوئی شدید غلطی ہوئی ہے۔ علی نے یقیناً کچھ اور کہا تھا۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔۔ سمجھی نہیں؟'' اُس نے اٹکتے ہوئے کہا تو علی نے پاس رکھی کرسی گھسیٹی، دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، ہاتھوں کو باہم پھنسا کر ذرا آگے کی جانب جھک کر بیٹھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسکے لیے یہ فیصلہ کتنا مشکل تھا۔

''میں اپنے بچوں کے لیے، یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دوبارہ نکاح کر لو۔ تاکہ تم اس گھر میں رہ سکو، تاکہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع بھی نہ ملے، اور تاکہ بچوں کو ماں اور باپ دونوں مل جائیں۔'' اُس نے ایک بار پھر سر جھکائے اپنی بات کو واضح کیا۔ پر اب اُسکا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''پر میں۔۔۔''فاطمہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''دیکھو فاطمہ! مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں کہ تم نے ماضی میں کیا کیا تھا؟اور کیا نہیں؟ میں نے کہانا! میں اب حساب کتاب سے آگے بڑھ کر صرف اور صرف اپنی اولاد کا سوچ رہا ہوں۔اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنے اور میرے مسائل کو پرے رکھ کر صرف بچوں کا سوچو۔اگر تم راضی ہو تو میں کل ہی نکاح کرنے کو تیار ہوں۔''کمرے میں اسکی مستحکم اور ٹھوس آواز گونجی تو جیسے اُسکے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ رہا۔ آج وہ اُسکا نام لے کر بات کر رہا تھا۔وہ **اُس عورت** سے پھر فاطمہ ہو گئی تھی۔

''میں سوچنے کا وقت چاہتی ہوں۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''وقت ہی تو نہیں ہے فاطمہ!''علی نے تیزی سے کہا تو وہ ساکت ہوئی۔یہ جملہ تو اُسے کہنا چاہیے۔وقت تو اُسکے پاس کم تھا۔

''تم مجھے جانتی نہیں ہو کیا؟ پھر بھی سوچنا ہے؟''اُس نے کہا تو فاطمہ نے چہرہ جھکا دیا۔علی کو اپنے جملے کا احساس ہوا،وہ اُس پر اپنا فیصلہ ایسے تھوپ نہیں سکتا تھا۔خود کو بہت بدلنے کے باوجود بھی جذباتی پن،اُس میں ابھی بھی کہیں کہیں باقی تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ،اب اتنا آسان نہیں ہے تمہارے لیے۔''اب کہ وہ بولا تو لہجہ آہستہ تھا۔''اگر تم صرف بچوں کا سوچو تو ہاں کہہ سکتی ہو،پر اگر تمہیں مجھ سے مسئلہ ہے تو ہاں! تمہارے پاس انکار کا حق ہے۔میں خدانخواستہ کوئی زبردستی نہیں کر رہا بس۔۔۔مجھے بچوں کے لیے یہی بہتر لگا تو تم سے کہہ دیا۔باقی جب تم سوچ لو،تو مجھے بتا دینا۔''وہ کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا،پھر جانے کے لئے مڑ گیا۔ابھی دروازے پر ہی تھا کہ

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔''فاطمہ کی آہستہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو جیسے دل سے منوں بوجھ سرکا۔

''شکریہ!''اُس نے بنا مڑے ہی ہلکے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

ابھی سیڑھیاں اُتر ہی رہا تھا کہ لیونگ روم میں بے چینی سے ٹہلتے سفیر صاحب پر نگاہ پڑی۔احمد پاس ہی صوفے پر خاموشی سے بیٹھا تھا، برابر میں نشمیہ ساری دنیا سے بے گانہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں پر لگی تازہ مہندی کو پھونکے مارنے میں مصروف تھی۔سفیر صاحب نے اپنے

ملازم کی بیٹی کو چاند رات پر اُسے مہندی لگوانے کے لیے بلالیا تھا۔اِس طرح اُسکی بھی کچھ کمائی ہوگئی اور نشمیہ کو مہندی بھی لگ گئی۔چاند رات مکمل تھی!

''آں بھائی۔۔۔''احمد ذرا سا ہلا تو وہ چیخ اُٹھی۔

''میری مہندی خراب ہوجائے گی۔''مہارانی صاحبہ نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔اب جاکر علی نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر بھی مہندی لگائے،انہیں اپنے بھائی کی گود میں رکھے بیٹھی تھی تاکہ مہندی خراب نہ ہو۔شوق تو دیکھواِس ڈیڑھ فٹی چوزی کے!

''میں نے کیا کیا؟''احمد نے گھبرا کر پوچھا۔

''تم میری مہندی خراب کررہے ہو بھائی!''

''اب میں ذرا سا ہلوں بھی نہیں؟''وہ جھنجھلایا۔

''نہیں!''اُس نے حکم نافذ کیا تو وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔علی بیساختہ ہنسا تھا۔اُسکے ہنسنے پر سفیر صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو وہ آخری سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے اُسکے پاس آئے۔

''کیا کہا فاطمہ نے؟''اُنہوں نے پوچھا۔علی تھوڑی دیر قبل ہی اُنہیں اپنے فیصلے کے متعلق آگاہ کرچکا تھا۔

''وہ راضی ہے۔''اُس نے آسودہ سے لہجے میں کہا تو خوشی سے انکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''میں انتظام کرتا ہوں۔''اُنہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔دوسری جانب احمد نے بڑے آہستہ سے نشمیہ کے پاؤں اُتار کر صوفے پر رکھے اور اُسکے شور مچانے کے باوجود علی کے پاس آیا۔

''میں امی کے پاس چلا جاؤں؟''اُس نے اجازت چاہی۔

''ہاں! بالکل۔۔۔''اُس نے مسکرا کر اجازت دی۔

''بابا! بھائی نے میری مہندی خراب کردی۔''چھوٹی فنکارہ نے بھی روتے ہوئے وہاں انٹری دی تھی۔

''بالکل خراب نہیں ہوئی ہے۔ پوری سوکھ چکی ہے۔'' احمد نے فوراً کہا۔

''بھائی میری بالکل بات نہیں سنتا۔'' اُس نے منہ بسورتے ناراضگی سے شکایت کی تو احمد بھونچکارہ گیا۔

''میں نے کب تمہاری بات نہیں سنی؟'' اُس نے خفا خفا سے انداز میں پوچھا۔

''تم میری کوئی بات نہیں سنتے!'' وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ علی پنجوں کے بل بیٹھا اور اپنی ناراض ناراض سی بیٹی کو اپنے ساتھ لگایا۔

''پہلے تو نشمی! بھائی کو تم نہیں آپ کہا کرو۔ اور تم بھی کبھی کبھی بھائی کی بات مان لیا کرونا۔ ہمیشہ اپنی بات نہیں منواتے، کبھی کسی کی مانتے بھی ہیں۔'' اُس نے پیار سے سمجھایا۔

''ہاں! لیکن آپ تو میری کوئی بات نہیں مانتے۔'' اُسکے اپنے ہی غم تھے۔

''کوئی علاج نہیں ہے تمہارا!'' وہ ہنسا۔

''دادا!'' سیڑھیوں پر کھڑے احمد نے اپنے دادا کو اچانک ہی مخاطب کیا جو مسکراتے ہوئے نشمیہ کو دیکھ رہے تھے۔

''ہاں بیٹے!'' اُنہوں نے پوچھا۔

''کیا مہندی والی باجی چلی گئی ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔ اِس سوال پر سفیر صاحب کے ساتھ ساتھ علی نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔

''نہیں! وہ ابھی اپنے کوارٹر میں ہی ہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں کیا۔۔۔امی کو بھی۔۔۔۔مہندی لگوا سکتا ہوں؟'' اُس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل! لیکن پہلے اپنی امی سے پوچھ لو۔ اگر وہ مان جائیں تو مجھے بتانا میں فوراً بجھوا دوں گا۔'' انہوں نے کہا۔

''میں اُنکو منالوں گا۔'' اُس نے چہکتے ہوئے کہا اور تیزی سے اوپر بھاگا تو علی بے یقینی سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ احمد نے کبھی ایسے بچوں جیسی خوشی نہیں دکھائی تھی، وہ کبھی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش نہیں ہوا تھا، نہ ہی اُس نے کبھی کوئی جلد بازی دکھائی تھی۔ پر اپنی ماں کے لیے وہ سب کچھ تھا۔ لڑکے اپنی ماں کے لیے واقعی بچے ہوتے ہیں۔ علی مسکرا دیا، پھر چہرہ موڑ کر اپنے کندھے سے لگی، ہاتھوں پر لگی مہندی

کو کسی متاعِ حیات کی طرح دیکھتی نشمیہ کو دیکھا۔ اُسکے ننھے ننھے ہاتھوں پر مہندی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اُس نے بیساختہ ہی اُسکے ہاتھوں کو چوما۔

''آں۔۔۔ آپ لوگ کیوں میری مہندی خراب کر رہے ہیں؟''اِس بے وقت پیار پر وہ مزید جھنجھلائی۔ ایک تو سارا گھر مل کر اُسکی مہندی خراب کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''اب اسے دھونے کا وقت آ گیا ہے نشمیہ صاحبہ!''علی نے اُسے گود میں لیکر اُٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں صبح دھوؤں گی۔''مجال ہے جو وہ ایک بار میں کوئی بات سمجھ لے؟

علی اُسے لیے باتھ رُوم کی طرف بڑھ گیا تاکہ اُسکے ہاتھ پاؤں دھلوا سکے۔ جبکہ پیچھے کھڑے سفیر صاحب آنے والے وقت کی خوشیاں محسوس کر رہے تھے۔

پر جو وہ نہیں جانتے تھے۔۔۔

وہ مورخہ چھے کو ہونے والا ممکنہ سانحہ تھا۔۔۔

لاعلمی۔۔۔

بڑی نعمت ہے۔۔۔

----------+---------+--------

رمضان اپنی برکتیں سمیٹتا واپس چلا گیا۔ اور اپنے پیچھے خوشیوں بھرا انعام عید دے گیا۔

عید کی صبح۔۔۔

برکتوں والی۔۔۔ رحمتوں والی۔۔۔

انعام والی۔۔۔ پیام والی۔۔۔

ہلکے جامنی رنگ کے جوڑے میں، بل کھاتے بالوں کو کیچر میں مقید کر کے آدھا کھلا چھوڑے، جزانک سک سے تیار اپنے گھر کے کچن میں کھڑی کھیر کو پیالوں میں نکال رہی تھی۔ ستواں ناک پر چمکتی لونگ اُسکی سانولی رنگت پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وحید کی بیوی اور بچے آئے ہوئے تھے، خود وہ اِس سال عید پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی خاطر گھر پر نہ تھا۔

کھیر کے پیالوں کو ٹرے میں رکھ کر جب وہ لاؤنج میں آئی تو وحید کے دونوں بچوں نے اُسے گھیر لیا۔

''پھپھو آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں۔'' وحید کی بیٹی نے اُسے دیکھ کر چہکتے ہوئے کہا تو وہ ہنسی، پھر ٹرے میز پر رکھ کر پنجوں کے بل بیٹھی اور اُسکے گلے لگ گئی۔

''عید مبارک میری جان!'' اُس نے بھتیجی کو گلے لگاتے ہوئے کہا، پھر اُسکے بھائی کو بھی گلے لگایا۔

''پھپھو میری عیدی!'' اُس نے فوراً ہاتھ آگے کیے تو سب لوگ ہنس دیئے۔

''وہ میں کمرے میں ہی بھول گئی۔ ابھی لیکر آتی ہوں۔'' وہ جلدی سے اُٹھی اور ہنستے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ پھر میز پر رکھے سامان میں سے وہ لفافے تلاش کرنے لگی جو اُس نے اپنے بھتیجوں اور پناہ گاہ کے بچوں کے لئے بنائے تھے۔ تب ہی اُسکی نظریں، اُس کاغذ پر گئیں جسکے نیچے ڈاک کا لفافہ رکھا تھا۔ اُسکے ہاتھ تھمے۔ اُسے یاد آیا کہ کل رات وہ اُسے لکھتے لکھتے سو گئی تھی۔ اُس نے کاغذ اُٹھا لیا۔

''عید مبارک وحید بھائی!

آپ ڈیوٹی پر ہوں گے، جب یہ خط آپکو ملے گا، عید گزر چکی ہو گی۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ڈیوٹی پر پہلی بار بہن کا خط کیسے آ گیا؟ بھائی! مجھے جذبات کا اظہار کرنا نہیں آتا، شاید ہم تینوں بہن بھائیوں کو ہی نہیں آتا۔

آپ اُس روز مجھے اتنا کچھ کہہ کر چلے گئے، مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا، نہ کوئی وضاحت دینے دی نہ ہی معافی مانگنے دی۔ جذبات کے اظہار کے لیے قلم ایک اچھی شے ہے، سو چا آپکو لکھ کر ہی بھیج دوں۔

بھائی! نہ میں ظالم ہوں، نہ ہی اتنی بے حس کہ اینٹوں سے بنے ایک گھر کے لیے اپنے مردہ بھتیجوں کو بھول جاؤں۔ایسا بھی نہیں ہے، کہ میرے دل میں اُنکے لیے محبت نہیں تھی۔بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ اُنکے بچے پیارے ہیں لیکن۔۔۔ پھر وہی بات کہ مجھے اظہار نہیں آتا۔

کہاں سے شروع کروں؟ وہاں سے جب ابّو نوید بھائی کو مارتے تھے اور میں مزید جھوٹی شکایت لگا کر انہیں مار پڑواتی تھی۔میں بری تھی، بہت بری۔۔۔ پر میں بچی تھی۔مجھے لگتا تھا کہ بھائی کوئی بہت ہی برا انسان ہے، جب ہی تو ابّو اُسکے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔ورنہ ابّو برے ہوتے تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے۔ابّو برے نہیں تھے بھائی، برا نوید بھائی بھی نہ تھا، برا بس زمانہ تھا، وہ ڈراما تھا جو نسل در نسل چلتا چلا آیا تھا۔مجھے دکھ اِس بات کا ہے کہ میرے بھائیوں کو یہ تو یاد رہا کہ میں اُنکی جھوٹی شکایت کرتی تھی، پر یہ یاد نہ رہا کہ جب میں بڑی ہوئی اور مجھے سمجھ آیا کہ یہ غلط ہے، تو میں نے اُنکی کتنی ہی غلطیوں اور کتنی ہی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کی ہے۔

بھائی! ایسا نہیں ہے کہ مجھے اپنے بھائی سے محبت نہیں ہے۔ہے! بہت ہے۔۔۔ آپ یاد کریں بھائی کہ میں نوید بھائی سے بات کرنا چاہتی تھی، اُنکے ساتھ ہنسی مذاق کرنا چاہتی تھی، میں چاہتی تھی کہ وہ میرے ساتھ ویسے ہی رہیں جیسے اور بہن بھائی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔پر وہ مجھے جھڑک دیتے تھے۔وہ مجھے بہت بری طرح ڈانٹ دیتے تھے۔جو میں نے بچپن میں کیا وہ مجھے یاد نہیں، میں نے کہا نا! میں بچی تھی۔لیکن کیا مجھ سے بڑے اور سمجھدار بھائیوں کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ مجھے میرے بچپن کے گناہوں کی سزا نہ دیتے، میری بچپنے میں کی گئی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتے؟ کیا ضروری تھا کہ جب میں بڑی ہو گئی تو وہ مجھ سے بچپن کا بدلہ لیتے؟ بھائی کے اِس مستقل رویے نے میرے دل میں اُنکے خلاف بغض بھر دیا۔اور مجھے وہ برے لگنے لگے۔

پھر جب بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے، تو وحید بھائی! آپ نہیں جانتے۔۔۔ آپ نہیں جانتے کہ ابّو کس کرب سے گزرے تھے۔آپ نہیں جانتے کہ وہ ساری ساری رات روتے تھے۔بھائی! کیا ماں باپ کو غلطیوں کی سزا دینی چاہیے؟ کیا انہیں معاف نہیں کرنا چاہیے؟ کیا اُنکے ساتھ در گزر نہیں کرنا چاہیے؟ گھر سے جانے کے بعد آپ تو ابّو سے ملنے آ بھی جاتے تھے پر نوید بھائی نے پلٹ کر ایک بار نہیں پوچھا۔میں انتظار میں رہی کہ شاید وہ کسی روز آ جائیں۔۔۔ کسی روز آ جائیں تو ایک بار ابّو انہیں گلے لگا سکیں۔لیکن وہ نہیں آئے۔اُنکے اِس رویے نے میرے دل میں اُنکے لیے نفرت بھر دی۔یہاں تک کہ ابّو اُنکی راہ تکتے تکتے دنیا سے چلے گئے۔جس روز ابو کا انتقال ہوا، اُس روز بھی ابّو بھائی کو منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔پر وہ آگے نہیں بڑھے، کیا تھا جو وہ ایک بار ابّو کے پاس آ جاتے؟

ہاں! میں مانتی ہوں کہ میں بہت غلط ہوں، بہت زیادہ۔۔۔پر بھائی میرے اِس رویّے کے پیچھے ابّو کی بے تحاشا محبت تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ابّو بھائی کے جانے کے غم میں مرے ہیں، وہی ذمّے دار ہیں اُنکی موت کے۔

ہاں! یہ بھی سچ ہے کہ جب وہ گھر، جس میں میرے باپ کی یادیں تھی، اُسے آپ نے بیچنے کی بات کی تو میرا دل مزید متنفر ہو گیا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بھائی نے مجھ سے میرا باپ چھینا اور ایک نے میرے باپ کا بنایا گھر۔ میں اپنے غصّے میں اندھی ہو گئی تھی۔ لیکن بھائی! میرے صرف ایک سوال کا جواب دیں۔ جب بھائی اِس گھر کو چھوڑ کر گئے، تو بے شک اُنکے ابّو سے جو بھی مسائل تھے، وہ مجھ سے تو رابطہ کر سکتے تھے نا؟ کیا اُنکی اکلوتی بہن نے انکا انتظار نہیں کیا تھا؟ کیا اُنکی مجھ سے کوئی دشمنی تھی؟ کیا تب تک میں نے اُن سے قطع کلامی کی تھی؟ میں نے تین ماہ تک انتظار کیا کہ شاید بھائی کو میری یاد آئے، وہ کم از کم مجھے ایک بار میسج تو کریں، پر نہیں! اُنہوں نے ابّو کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ اب بتائیں بھائی! پہل کرنے والا کون تھا؟ میں یا نوید بھائی؟

میں اِس وقت حساب کتاب نہیں کر رہی۔ نہ یہ کہہ رہی ہوں کہ میں صحیح تھی اور بھائی غلط۔ غلط میں بھی تھی، اور صحیح بھائی بھی تھا۔ ہم سب ہی کہیں نہ کہیں ظالم ہوتے ہیں۔ جب بھائی کے بچوں کا انتقال ہوا، تو ہاں! میں آئی تھی اور میں وہاں رہی بھی تھی۔ پر کیا آپ جانتے ہیں میں کیوں واپس چلی گئی؟ میں نوید بھائی کو اِس حال میں دیکھ کر بھی انکو گلے نہیں لگا سکی تھی۔ میں اپنے بھائی کو تسلی کے دو لفظ بھی نہ بول سکی تھی۔ اور اِس شرمندگی کو چھپانے کے لیے میں واپس آ گئی، میں اُنہیں اِس حال میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کہا نا! مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔ پر میں چاہتی تھی کہ امی وہاں رہے۔

اور آج میں آپکو ایک سچ بتانا چاہتی ہوں، ایک ایسا سچ جو میں نے اِس لیے چھپا کر رکھا کہ میں اپنی ماں کو آپکی یا بھائی کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتی۔ وہ یہ کہ جب امی انتقال کے گھر سے واپس آ گئیں، تو اُنہوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ تم وہاں سے کیوں آئی؟ اس لیے کہ تمہیں نوید سے نفرت ہے؟ تمہاری وجہ سے مجھے بھی یہاں آنا پڑا اور وحید اِس بات پر بہت غصّہ ہے۔ خدا کی قسم بھائی! یہ غلط اندازہ میرے بارے میں اُنہوں نے خود ہی لگایا تھا، اور وہی اُنہوں نے آپکو بھی بتا دیا۔ حالانکہ میں اُس وجہ سے وہاں سے نہیں آئی تھی، اور میں آپکی اور بھائی کی غلط فہمی دور بھی نہ کر سکی کہ میرے اور آپ دونوں کے درمیان اتنے فاصلے آ چکے تھے کہ میں کچھ ٹھیک نہیں کر سکی۔

ہاں! ایک جگہ میری غلطی ہے، اور اُسے میں تسلیم کرتی ہوں، گو کہ اب تسلیم کرنے سے کچھ نہیں بدل سکتا پھر بھی۔ وہ یہ کہ ابّو کی محبت مجھ پر زیادہ غالب رہی ہے ہمیشہ، اور کبھی کبھی تنہائی میں اُنہیں یاد کرتے ہوئے مجھ پر پھر سے اپنے بھائیوں کا رویہ گراں گزرنے لگتا اور مجھے ایسا لگنے لگتا کہ اُن ہی کی وجہ سے میرے ابّو مرے ہیں۔ اُس پر سے میں جب بھی امی کو دیکھتی تو مجھے وہاں ایک ایسی ماں نظر آتی، جو ہر بار آس بھری نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھتی ہے کہ شاید وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھ لے، پر ہر بار وہ بیٹا، انہیں کرائے کے گھروں میں چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی انہیں اپنے بیٹے ہی زیادہ پسند ہیں، مجھے کبھی امی کی نظر میں وہ مقام نہیں مل سکا جو اُنکے بیٹوں کا تھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر کر میرے دل میں آپ دونوں کے لیے نفرت پھر سے سانے لگتی اور شرمندگی کا عنصر مٹنے لگتا۔ میں بہت کنفیوز رہنے لگی تھی بھائی! صحیح اور غلط کی کشمکش نے مجھے پاگل کر رکھا تھا۔ اُس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا، میں شدید اسٹریس میں تھی، اور جب امی نے مجھ سے کہا کہ ہمیں نوید بھائی کے گھر جا کر رہنا ہے تو نجانے میں نے کیا کیا کہہ دیا؟ ہوش تب آیا، جب میں نے دروازے پر نوید بھائی کو کھڑا دیکھا۔ آپکی طرح اُنہوں نے بھی مجھے وضاحت کا موقع نہیں دیا۔ اور اُس روز سے لیکر آج تک میں پچھتا رہی ہوں کہ میں نے وہ سب کیوں کہا؟ میں کیوں اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکی؟ میں کیوں اپنے بھائیوں کو بتا نہیں سکی کہ وہ اہم ہیں؟ میں آج تک شرمندہ ہوں بھائی اور میری یہی شرمندگی مجھے نوید بھائی کے سامنے نہیں آنے دیتی۔ اُسکے پیچھے نہ انا ہے اور نہ ہی اینٹوں سے بنے گھر کی محبت۔

پر ہاں! اب سے میں خود کو بدلوں گی، اب سے میں ہی پہل کروں گی۔ لیکن فقط ایک گزارش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بھائی بھی تو مجھے سمجھیں۔

آپکی بہن

جزائے خیر عالم۔"

اُس نے خط کو تہہ کیا، اور پھر اُسے لفافے میں ڈالنے کے بعد اپنے پرس میں رکھتے باہر آئی۔ ارادہ تھا کہ بچوں کو عیدی دے کر پناہ گاہ جائے گی۔ پر لاؤنج میں بیٹھے نوید اور بشریٰ کو دیکھ کر اُسکے قدم منجمد ہو گئے۔ یہ پہلی بار تھا، جب نوید بشریٰ کے ساتھ عید ملنے آیا تھا اور وہ بھی بنا کسی دعوت کے۔ امی تو خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ بشریٰ کے ہاتھوں پر مہندی سجی ہوئی تھی، آنکھیں غم زدہ سی پر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ وحید کے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ جزا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی لاؤنج میں آئی۔

"تم کہیں جارہی ہو؟" امی نے اُسکے کندھوں پر پرس دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں! کہیں نہیں۔" نوید کے سامنے کہہ نہیں سکی کہ پناہ گاہ جانا ہے۔ ابھی پرسوں ہی تو بتایا تھا اُس نے کہ وہ رضا کا دوست ہے۔ پتہ نہیں کیسے؟ پر ہے۔

"عید مبارک بھابھی!" اُس نے آگے بڑھ کے بشریٰ کو کہا تو وہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی اور اُسکے گلے لگی۔ عید تو اپنوں کو گلے لگانے کا ایک بہانہ ہے بس!

"آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" اُس نے بشریٰ کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مُسکرائی۔ وہ مسکرائی تو نوید بھی مسکرایا۔ کچھ دیر وہ لوگ وہاں بیٹھے رہے۔ پھر نوید کا فون بجا۔

"علی کالنگ" کے الفاظ واضح ہوئے۔

"میں آتا ہوں۔" وہ کال لینے کے لیے اٹھا۔

"بشریٰ تیار رہو، میں تمہیں تمہارے بھائی کے گھر چھوڑ دوں گا۔" وہ اُسے کہتا ہوا گھر کے لان کی طرف آیا۔ جزا نے اُسکو لان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اُسے یقیناً بشریٰ کے ساتھ اُسکے میکے بھی جانا تھا، وہ اِن سب تکلفات میں نہیں پڑتا تھا لیکن بشریٰ کی حالت کے پیش نظر اب وہ سب کر رہا تھا۔ جزا کچھ دیر دروازے کی طرف دیکھتی رہی، پھر یکدم ہی اُٹھی۔

"میں آرہی ہوں۔" وہ سب کو کہتی ہوئی لان میں آئی۔ نوید فون کان سے لگائے بات کر رہا تھا، جزا کی جانب اُسکی پیٹھ تھی۔ وہ اُس سے کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے! مجھے دو گھنٹے لگیں گے۔ میں آتا ہوں اُسکے بعد۔" وہ فون پر کہہ رہا تھا، جبکہ جزا بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

"بشریٰ تم کیا۔۔۔" وہ فون رکھ کر، اپنے پیچھے موجودگی کا احساس کر کے مڑا تو سمجھا شاید بشریٰ ہوگی، پر جزا کو دیکھ کر چونکا۔ پھر سر جھٹک کر موبائل میں کچھ لکھنے لگا۔ جزا کی رہی سہی ہمت بھی ہوا ہونے لگی۔

"بب۔۔۔ بھائی!" اُس نے پکارا۔

''ہونہہ؟''اُس نے موبائل سے سر اٹھائے بناہی کہا۔

''عید مبارک!''اُس نے کہا۔اور نوید نے شدید حیرت سے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''ہاں؟''بھنویں اچکا کر اُسے سوالیہ نظروں سے ایسے دیکھا جیسے سمجھ نہ آیا ہو۔

''میں نے کہا عید مبارک!''اب کہ اسکی ہمت بحال ہونے لگی۔

''آں۔۔۔ہاں ہاں! عید مبارک! تم بشریٰ کو بھیج دو۔''اُس نے کہتے ہوئے دوبارہ موبائل میں سر جھکا دیا۔نجانے کس سے بات کر رہا تھا؟ جزا نے نہایت ہی برا منہ بنایا اور جی اچھا کہتی جانے کے لیے مڑی۔

''رضا پناہ گاہ آگیا ہے؟''اُس نے یکدم ہی پوچھا تو وہ حیرت سے مڑی،اُسکی نظریں اب تک موبائل پر ہی تھی۔

''آپکا دوست ہے،آپکو نہیں معلوم؟''اُس نے چڑ کر کہا تو نوید نے آنکھیں اٹھا کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا،دوسرے لفظوں میں گھورا۔

''آگیا تھا رات کو۔''جزا نے خائف ہوتے کہا۔

''ٹھیک ہے! بشریٰ کو بھیج دو۔''اُس نے ایک مرتبہ پھر موبائل میں چہرہ دیا۔

''بھائی!''اب کہ جزا نے جی کڑا کر کے اُسے ایک بار پھر مخاطب کیا۔

''بولو!''اُسکا انداز ویسا ہی مصروف سا تھا۔

''میری عیدی؟''یہ سوال کرنا جتنا مشکل تھا،نوید کے لیے ہضم کرنا اُس سے کہیں زیادہ مشکل۔موبائل پر ٹائپ کرتی اُنگلیاں روک کر اُسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا کہا؟''پوچھا ایسے جیسے اُسکی دماغی صحت پر شک گزرا ہو۔

''میری عیدی تو دیں۔''اُسکی ہمت بڑھنے لگی۔

''میں۔۔۔میں نے لفافہ بنایا نہیں ہے۔''نوید عالم پہلی بار گڑ بڑایا۔

''ایسے ہی دے دیں۔ بنا لفافے کے۔''اُس نے دھونس بھرے انداز میں کہا تو وہ مزید حیران ہوا۔ وہ آج اسے چونکا رہی تھی۔

''میرے پاس نقد رقم موجود نہیں ہے اِس وقت۔''اُس نے بہانہ بنایا۔

''دس بیس روپے ہی دے دیں۔ ایسی بھی کیا کنجوسی!''اُسکے مان بھرے لہجے پر نوید عالم لمحے کو ساکت ہوا۔ کیا اُس نے کبھی جزا کا ایسا لہجہ اور انداز دیکھا تھا؟ ہاں! دیکھا تھا۔ بالکل دیکھا تھا۔

وہ سولہ سال کا تھا، اور جزا آٹھ سال کی۔ عید کے دن غرارے اور نیٹ کے چھوٹے سے دوپٹے کو گلے میں ڈال کر اُسکے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

''بھائی میری عیدی دیں!''اپنی ننھی ننھی ہتھیلیاں آگے کر کے جزا بولی۔

''مجھے تنگ مت کرو!''ہمیشہ سے بیزار نوید نے کہا۔

''عیدی دے دیں پھر تنگ نہیں کروں گی۔''اُس نے کمر پر ہاتھ رکھتے، دھونس بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں دوں؟''اُس نے غصّے سے پوچھا۔

''بھائی دیتے ہیں بہن کو۔''اُس نے سمجھداری سے بتایا۔

''نہیں ہو تم میری بہن! تم نے ہمشہ مجھ سے بد تمیزی کی ہے، ہمیشہ میری جھوٹی شکایتیں کی ہیں۔ تم بہت بری ہو۔''صبح صبح اُسکی کسی بات پر کلاس ہوئی تھی، وہ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ لٰہذا غصّہ اُسی پر نکال دیا۔ اُسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آنے لگے، نوید کی عید خراب ہوئی تھی تو اب وہ اپنے آس پاس موجود ہر انسان کی عید خراب کر دینا چاہتا تھا۔ ایسے ہی منتقل ہوتے ہیں جنریشنل ٹراما۔

''میں نے کیا کیا بھائی؟''اُس نے ننھے ننھے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے، بھیگے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! جاؤ اور جا کر ابّو کو میری شکایت کر دو۔ تمہیں یہی تو آتا ہے۔''اُسکا غصّہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''باہر سے ابّو کی بلند آواز سنائی دی۔

''کچھ نہیں ابّو! میں کھیل رہی ہوں یہاں!''جواب جزا نے دیا تھا۔ پھر وہاں سے بھاگ گئی،اُس نے اپنے بھائی کی شکایت نہیں کی۔پر اُس روز کے بعد وہ دوبارہ کبھی اُس سے عیدی مانگنے نہ آئی۔

''کیا دس بیس روپے بھی نہیں ہیں؟''اُسکی آواز نے نوید کو ماضی سے باہر کھینچا۔ چھوٹی سی جزا اب بڑی ہوگئی تھی۔اور آج بھی ہاتھ پھیلائے ایسے ہی کھڑی تھی۔نوید نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اندر سے ایک خوبصورت سا لفافہ نکالا،اس پر جزا کا نام سنہرے مارکر سے لکھا ہوا تھا۔

''یہ لو!''اُس نے لفافہ اُسکی جانب بڑھایا تو اُس کا مارے حیرت کے منہ ہی کھل گیا۔

''ابھی تو کہہ رہے تھے کہ لفافہ نہیں ہے۔''اُس نے لفافہ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں ہر سال بناتا ہوں۔پر تمہیں دے نہیں پاتا۔''اُس نے آہستہ سے کہا تو وہ حیران سی اُسے دیکھنے لگی۔

''بشریٰ کو بھیج دو!''وہ کہہ کر تیزی سے جانے کے لیے مڑ گیا۔اس سے زیادہ جذبات کا اظہار وہ نہیں کر سکتا تھا۔ جزا کی طرح اُسکا بھائی بھی اظہار کے معاملے میں چور تھا۔ وہ ہنسی،اور پھر ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔اُسکی ہنسی گاڑی کا دروازہ کھولتے نوید نے باخوبی سنی تھی۔وہ اُسکے بچپنے پر بیساختہ مسکرا کر رہ گیا۔

غلطی ہمشہ ایک جانب سے نہیں ہوتی۔

غلطیاں۔۔۔

دونوں جانب سے ہوتی ہیں۔۔۔

لہٰذا سدھارنا بھی دونوں کو ہی چاہیے۔۔۔

----------+---------+--------

مکرم کو اپنے جیسا ہی لباس پہنا کر، پھر اُسے تیار کر کے مقدّم عید کی نماز کے لیے نکل رہا تھا۔ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ سامنے کھڑے وجود کو دیکھ کر لمحے کے لیے حیران کھڑا رہ گیا۔

''اخلاق ؟'' مقدم چیخا اور اگلے ہی لمحے اُسکے گلے لگ گیا۔ ننھا مکرم، آنکھیں کھولے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے مقدّم نے گھاس پر کھڑا کرر کھا تھا۔

''تم کیسے آ گئے ؟'' اُس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سرپرائز!'' احلاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عید کے دن کا بہترین آغاز ہوا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''نماز ہو گئی ہے کیا؟'' اخلاق نے سوٹ کیس لان کی دیوار کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! چلو! نماز پڑھنے ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' مقدّم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں!'' اُس نے جھک کر مکرم کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔

''تم نے کیا جواب دیا مقدّس کو؟'' راستے میں اخلاق نے اُس سے پوچھا۔

''میں نے اُس سے تمہارے کراچی آنے تک کا وقت مانگا تھا۔ آج جواب دے دوں گا۔'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مقدّم نے جواب دیا۔

''میرا انتظار ؟ کس لیے ؟ بھئی خود فیصلہ کرو۔'' اخلاق نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میری فیملی میں تمہارے علاوہ ہے ہی کون ؟ اب تم سے مشورہ بھی نہ کروں ؟'' اُس نے کہا۔

''میں نے فون پر ہی مشورہ دے دیا تھا تمہیں کہ جو تمہارا فیصلہ ہو گا، میں اُس میں خوش ہوں۔'' اُس نے کہا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ مقدّس چاہتی ہے کہ میں اُسکے ماں باپ سے ملوں اور خود رشتہ مانگوں۔ اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ انکار کر دیں گے۔'' وہ کچھ پریشان تھا۔

''کیوں انکار کر دیں گے ؟''

’’تم نہیں جانتے؟ جب میں انکے پاس مکرم کو لیکر گیا تھا تو اُنھوں نے اُسے ایک باغی کی اولاد کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ لوگ اپنی فضول کی روایات میں اتنا جکڑے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی کی خوشیوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔‘‘ وہ تلخی سے گویا ہوا۔

’’اگر وہ انکار دیں گے تو پھر تم کیا کرو گے؟‘‘ اخلاق نے اُسے غور سے دیکھا۔

’’اسی لیے تو تمہیں یہاں آنے کو کہا تھا۔ تم ہی مجھے مشورہ دے سکتے ہو کہ میں کیا کروں؟‘‘ وہ حقیقتاً پریشان تھا۔

’’کیا تم جانتے ہو میں آج یہاں کیوں آیا؟‘‘ اخلاق نے اچانک ہی پوچھا۔

’’مجھ سے ملنے۔‘‘

’’ہاں! پر آج ہی کے دن کیوں؟‘‘

’’چھٹی ہوگی تمہاری۔۔۔‘‘

’’نہیں! یہ وجہ بھی نہیں ہے۔‘‘

’’خود ہی بتا دو۔‘‘ وہ جھنجھلایا۔

’’مسئلہ یہ کہ کل مقدّس کے اماں اور ابّا مجھ سے ملنے میرے آفس آئے تھے۔ پہلی بار۔۔۔‘‘ اُس نے انکشاف کیا تو مقدّم نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

’’کیوں؟‘‘

’’تمہارے بارے میں بات کرنے۔ کہنے لگے کہ مقدم کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ نشہ وغیرہ کرتا تھا، ہم اپنی بیٹی کیسے دیں؟ میں نے کہا اگر نشہ کرتا تو وہ آپکے نواسے کو نہ پال رہا ہوتا اتنے عرصے سے۔ اِس بات پر وہ خاموش ہو گئے۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ وہ عید کے روز کراچی پہنچیں گے تا کہ تم سے مل سکیں۔ مجھے بتانے سے منع کیا تھا کہ وہ خود مقدّس کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔ اِس لیے میں بھی یہاں آگیا، تا کہ جو بات ہو سب کے سامنے ہو۔‘‘ اِس نے تفصیل سے بتایا۔

’’اوہ! یعنی مقدّس کو بھی یہ نہیں معلوم؟‘‘ اُس نے اندازہ لگایا۔

''ہاں! اُسے بھی اِس بات کی خبر نہیں ہے۔''

''کیا لگتا ہے وہ انکار کر دیں گے؟'' عید گاہ کے قریب گاڑی روکتے ہوئے اُس نے پوچھا تو اُسکے انداز پر اخلاق مسکرایا۔

''مجھے نہیں لگتا۔ اب نہ اُن میں وہ رعب رہا اور نہ وہ دبدبہ۔ بیٹی کے مرنے، اور نواسے کو خود سے دور کرنے کے بعد سے وہ خود بھی بہت پچھتاؤں کا شکار ہیں۔ اِس لیے پہلی بار مقدّس کو نوکری کرنے کے لیے خود سے اتنا دور بھیجنے پر بھی راضی ہو گئے، حالانکہ خاندان میں اِس بات پر سب اُن سے ناراض ہیں۔ تھوڑی تھوڑی انہیں بھی عقل آ رہی ہے۔ اور اگر انکار ہی کرنا ہوتا تو پہلے مجھ سے، اور پھر یہاں تم سے ملنے کیوں آتے؟ سیدھا فون پر ہی منع کر دیتے۔ یعنی اُنکے دل میں بھی کہیں اقرار ہے۔ بس! انکے کچھ خدشات ہیں۔'' اخلاق نے کہا تو اُسکے دل سے منوں بوجھ سرکا۔

''چلو! نماز شروع ہو جائے گی۔'' مقدّم نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔

----------+---------+--------

عید الفطر کی نماز ادا کرنے وہ، احمد اور ابّا کے ساتھ گیا تھا۔ نماز مکمل کر کے وہ سفیر صاحب سے گلے لگ کر عید ملا۔ شاید ایک لمبے عرصے بعد وہ اس طرح اُن سے عید ملا تھا۔ پھر احمد کی باری آئی، دادا سے تو اُس نے بخوشی گلے ملا، پر باپ سے ملنے آگے نہیں بڑھا۔ علی گھٹنوں کے بل بیٹھا، پھر خود ہی اُسکے گلے لگ گیا۔

نماز ادا کر کے جب وہ گھر پہنچا، تو احمد تیزی سے اندر بھاگا، یقیناً اپنی ماں سے ملنے کی جلدی تھی۔ جبکہ علی ابھی لان میں ہی تھا کہ اُسکے کانوں میں نشمیہ کی چہکتی آواز ٹکرائی۔

''بابا! عید مبارک۔۔۔'' وہ زور زور سے بولتی مرکزی دروازے کی چند سیڑھیاں اُترتی لان میں داخل ہو رہی تھی۔ علی اُسے دیکھ کر تھم گیا۔ آف وائٹ رنگ کے لمبے انگرکھا فراک میں، جسکی بیلیں لال رنگ کی تھی، اُس پر بیل کا ہم رنگ دوپٹہ گلے میں ڈالے وہ ننھے ننھے قدم بڑھاتی اُسکے پاس آ رہی تھی۔ آج اُسکے لمبے بالوں کو خوبصورتی سے باندھا گیا تھا، کانوں میں چھوٹی چھوٹی سی بالیاں اور مہندی لگے ہاتھوں میں پیاری پیاری سی چوڑیاں پہنے وہ اُسکے پاس آ رہی تھی۔ آج یقیناً اُسے اُسکی ماں نے تیار کیا تھا۔

کیا عید اتنی خوبصورت بھی ہوتی ہے؟ علی نے اُسے دیکھ کر سوچا۔ وہ قریب پہنچی تو وہ بیساختہ پنجوں کے بل بیٹھا۔ پر وہ رکی نہیں، بلکہ اسی طرح بھاگتی اُسکے گلے لگ گئی۔

"بابا! عید مبارک۔۔۔" وہ چلا چلا کر علی کو کم اور محلے والوں کو زیادہ عید کی مبارک باد دے رہی تھی۔ علی نے اُسے گود میں بھینچ لیا۔ آنکھوں میں تشکّر آمیز نمی اُتر آئی۔ خدا بھی کیسے کیسے مہربان ہوتا ہے؟

"میری جان! میری شہزادی! میرے دل کا ٹکڑا!" اُسے من پسند ناموں سے پکارتے علی نے اُسکے مہندی لگے معصوم سے ہاتھ چومے، پھر اُسکا ماتھا۔

"بابا! میں پیاری لگ رہی ہوں نا؟" خود کو پری سمجھتے گول گول گھومتے ہوئے پوچھا۔

"میری نشمیہ تو ہے ہی پیاری۔" علی نے اُسے گود میں لیکر کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔

"امی کی طرح؟" اُس نے پوچھا تو وہ رکا، پھر مُسکرایا۔ اور آہستہ سے بولا "ہاں!"

"میری عیدی؟" اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ! عیدی؟ نشمیہ کو پتہ ہے کہ عیدی کیا ہوتی ہے؟" اُس نے مصنوئی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! بہت سارے پیسے ہوتے ہیں۔" اُس نے زور و شور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور تم بہت سارے پیسوں کا کیا کرو گی؟" علی نے بہت سارے پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں تو ڈول ہاؤس خریدوں گی۔" ڈول ہاؤس کی بھرمار کرنے کے بعد بھی اُسکا دل نہیں بھرا تھا۔

"کیسے خریدو گی؟ تمہیں پتہ ہے کہ کہاں ملتا ہے؟"

"دکان میں!"

"دکان کیسے جاؤ گی؟"

''میں آپکو پیسے دے دوں گی۔ آپ لا کر دے دیجئے گا۔''اُس نے سمجھداری سے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں تمہیں عیدی دوں گا۔ پھر تم وہ مجھے واپس دو گی تا کہ میں ڈول ہاؤس لا سکوں؟''علی نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے زور زور سے سر ہلایا تو اُسکی ہنسی چھوٹ گئی۔

''میرا معصوم بچہ!''اُس نے ایک بار پھر اُسے سینے میں بھینچا تھا۔

''علی! تمہیں اپنے گواہان بلانے تھے نا؟''اُسی لمحے سفیر صاحب نے وہاں آتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے! میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔''اُس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ پھر نشمیہ کو گود سے اُتارا۔

''نشمی! جاؤ جا کر اپنے ابّا سے بھی عیدی لو، اور پھر مجھے دے دو تا کہ میں ڈول ہاؤس لا سکوں۔''اُس نے شرارت سے کہا۔

''یہ کونسی کرپشن (بدعنوانی) چل رہی ہے۔''سفیر صاحب نے اُسے گھورا۔

''کرپشن نہیں، یہ میرے اور میری بیٹی کے درمیان ڈیل (معاہدہ) ہوئی ہے۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر لان میں رکھی کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ سفیر صاحب نشمیہ کو لیکر اندر چلے گئے۔

علی نے سب سے پہلی کال نوید کو کی تھی۔

''السلام علیکم! عید مبارک!''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خیر مبارک!''نوید کی ازلی سنجیدہ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا تم آج مصروف ہو؟''اُس نے پوچھا۔

''فارغ بھی نہیں ہوں۔''اُسکی توقع کے عین مطابق جواب آیا تو وہ ہنسا۔

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تم میرے فیصلے کو کس نظر سے دیکھو گے؟ پر میں نے یہ اپنے بچوں کے لیے کیا۔ اور اُن کے مستقبل کا سوچتے ہوئے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔''اُسکی باتیں یقیناً نوید کو سمجھ نہیں آ رہی تھیں، پر وہ خاموش تھا۔

''میں نکاح کر رہا ہوں۔ فاطمہ سے۔۔۔''اُس نے آہستہ سے بتایا۔ دوسری جانب کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

''تم نے ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی، مبارک ہو تمہیں۔''اِس بار اُسکا لہجہ واقعی مسکراتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''کب کر رہے ہو نکاح؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں! یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ آج ہی ہے، ظہر سے پہلے۔ اور۔۔۔ اگر تم گواہی دو تو مجھے اچھا لگے گا۔''

''ٹھیک ہے! مجھے دو گھنٹے لگیں گے۔ میں آتا ہوں اُسکے بعد۔''اُس کہا اور پھر فون رکھ دیا۔ دوسرا فون اُس نے عمر کو ملایا تھا۔

''عید مبارک علی! کیسے ہو؟''اُس نے فون اٹھاتے ہی کہا تھا۔

''عید مبارک! الحمدُاللہ! تم سناؤ۔ کیا کر رہے ہو عید کے دن؟''اُس نے پوچھا۔

''میں نے کیا کرنا ہے؟ نماز پڑھ کر گھر آگیا ہوں۔ اب فارغ ہوں۔''اُس نے ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا۔

''میرا آج نکاح ہے۔''اُس نے آہستہ سے بتایا۔

''کیا واقعی؟''دوسری طرف وہ حیران ہوا۔

''ہاں! کل رات ہی فیصلہ کیا ہے۔''اُس نے بتایا۔

''ایسے اچانک؟''عمر تھوڑا حیران ہوا۔

''ہاں! اپنے بچوں کے لیے، میں نے اور فاطمہ نے دوبارہ نکاح کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''اُس نے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا۔

''میں خوش ہوں بہت! تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔''وہ واقعی خوش تھا۔ اُس کو اب سمجھ آیا تھا کہ کل علی نے اُس سے کیوں مشورہ مانگا تھا؟

''تو کیا تم آسکتے ہو، نکاح کی گواہی کے لیے؟ ظہر سے پہلے ہے۔''اُس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ میں بالکل آجاؤں گا۔''اُس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارا بہت شکریہ!'' علی نے کہا۔ پھر کچھ مزید باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔اب وہ اندر جا رہا تھا۔تاکہ بچوں کو عیدی دے سکے۔

----------+---------+--------

گھر کے بڑے کمرے میں سارا خاندان جمع تھا۔آج حسین کے گھر میں اُسکے والدین کی جانب سے اُسکے تمام ددھیال کو عید کی دعوت تھی۔ خوشیوں بھرے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

''ارے حور بیٹا! ادھر آؤ۔'' بڑے صوفے پر بیٹھی چھوٹی تائی نے، ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں ملبوس، گود میں اپنے روتے، چڑچڑے ہوتے بیٹے کو اٹھائی پھرتی حور عین کو بلایا۔

''جی تائی!'' وہ کمر پر لٹکے بیٹے کو کس کر پکڑتی اُنکے پاس آئی۔

''یہ لو بیٹا تمہاری عیدی۔'' اُنہوں نے لفافہ اُسکی جانب بڑھایا۔ ''اور یہ حسین کہاں ہے؟'' لفافہ اُسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

''شکریہ تائی! حسین تو کہیں مردوں میں بیٹھا ہو گا، آپ ایسا کریں۔اُسکی عیدی بھی مجھے ہی دے دیں۔'' اُس نے بڑے ادب سے کہا تو تائی نے حسین کا لفافہ بھی اُسے دے دیا۔لفافہ لیکر اُس نے باقی سب لوگوں کی جانب رخ کیا۔

''باقی لوگ بھی حسین کی عیدی مجھے دے دیں۔'' وہ اعلانیہ انداز میں کہتی پلٹی ہی تھی کہ پیچھے سینے پر ہاتھ باندھے، سنجیدگی سے گھورتے حسین کو کھڑا پایا۔

''ارے! تم یہیں تھے۔'' اُس نے دانت نکالے۔باقی سب ہنسنے لگے۔

''اِدھر دو میری عیدی!'' اُس نے سنجیدگی سے ہاتھ آگے کیے۔

''تم کہاں رکھتے پھرو گے اتنے لفافے؟ میں پرس میں رکھ لیتی ہوں نا! گھر جا کر تمہیں بحفاظت دے دوں گی۔'' اُس نے معصومیت سے کہا۔

''تاریخ گواہ ہے کہ جو شے تمہارے ہاتھ لگ جائے وہ کبھی بحفاظت مجھ تک نہیں پہنچتی،اور میرے پاس رکھنے کے لیے جیبیں ہیں نا! تم ہر گز پریشان نہ ہو۔'' حسین نے اُسکی ساری چالاکی پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔

''لو!''اُس نے منہ بسورتے ہوئے لفافہ واپس کیا۔ ''تمہارا بھلا ہی سوچ رہی تھی۔''اُس نے جتایا۔

''چالاک عورت۔۔۔''اُس نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

''تمام افراد متوجہ ہوں۔''پھر وہ یکدم ہی باآواز بلند بولا تو دوسرے کمروں میں موجود لوگوں نے بھی مڑ کر دیکھا۔

''کوئی بھی مظلوم، معصوم اور شریف انسان اپنی شرافت کی وجہ سے میری عیدی (ہاتھ سے حور عین کی جانب اشارہ کیا) اِس خاتون کو ہر گز نہ دے۔ اگر میں موجود نہ ہوں، تو میرا انتظار کریں، لیکن اِسکو نہ دیں ورنہ آپکی امانت مجھ تک کبھی نہیں پہنچے گی، اور آپکی عیدی قبول بھی نہیں ہو گی۔''اُس نے خاصی سنجیدگی سے کہا تھا۔ گھر میں موجود تمام افراد ہنس رہے تھے۔

''ہیں؟ عیدی ہے کہ زکوٰۃ جو قبول نہیں ہو گی؟''کسی نے لقمہ دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، پر میرے بچوں کی عیدی کہاں ہے حسین؟''اُسکے بڑے بھائی نے پوچھا۔

''پہلے میرے بچوں کے عیدی دیجئے!''اُس نے بڑے ہی ادب سے جواب دیا۔

''بچوں کی عیدی مجھے دی جائے گی۔''حور عین نے پہلے ہی اعلان کر دیا۔

''ایک کام کرتا ہوں، جو عیدی تم نے میرے بچوں کو دینی ہے، وہ تم رکھ لو اور میری طرف سے اپنے بچوں کو دے دو۔ اور میں تمہارے بچوں والی، اپنے بچوں کو دے دیتا ہوں۔''اُسکے بھائی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''اِس طرح تو بڑے بھیّا کا نقصان ہو گیا، کیونکہ ایک دو کو چھوڑ کر باقی تو انہی کے بچے ہیں سارے۔''کسی نے جملہ کسا تو وہاں قہقہہ پڑا۔ بڑے بھائی کے آدھا درجن بچوں پر چوٹ کی گئی تھی۔

اسی طرح ہنستے کھیلتے آج عید کا دن گزرنا تھا، لیکن اِس ہنسی مذاق کے دوران لمحوں کے لیے حسین کی نظریں حور عین پر گئیں۔ اُسکی گود میں اب حوریہ تھی، جبکہ بیٹا اُسکے قدموں سے لپٹا کھڑا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے کسی سے بات کر رہی تھی۔ دونوں گالوں پر پڑنے والے گڑھے واضح تھے۔

حسین کی ساری مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

ایف آئی اے کی آخری بریفنگ۔۔۔

پلان بی۔۔۔

اور وہ پُراسرار قاتل۔۔۔

ہر شے گڈ مڈ ہونے لگی تھی۔۔۔

----------+---------+--------

رضا بچوں میں عیدی بانٹ رہا تھا۔ چھوٹوں کو اُس نے عیدی کی جگہ تحفے دیئے تھے۔ جبکہ بڑوں کو اُس نے اجازت دی ہوئی تھی کہ وہ عیدی سے جو چاہے خریدیں۔ ابھی بھی وہ سب کو عیدی بانٹ کر فارغ ہوا تھا کہ دروازے سے داخل ہوتی جزا پر نظریں پڑیں۔

''عید مبارک!''اُس نے وہیں آتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

''خیر مبارک!''اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''تم نے کل میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے نا! میں ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔''اُس نے جتاتے ہوئے کہا پھر اُسے ہکا بکا چھوڑ کر بچوں کے پاس آگئی۔

سب سے پہلے اُس نے ننھے محمد کو گلے لگایا، ابھی اُسے خود سے الگ بھی نہ کیا تھا کہ ولید چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتا آیا اور اُسکے گلے لگا، پھر اُسکی دیکھا دیکھی، ارمینہ، رمشا اور دیگر چھوٹے بچے، اُس سے لپٹتے گئے یہاں تک کہ وہ ہنستے ہنستے فرش پر پوری بیٹھ گئی۔ منظر پیارا تھا لیکن رضا ایک بار پھر نظریں چراتے ہوئے باہر آگیا۔ سر میں درد اُٹھنے لگا، سگریٹ پینے کا شدت سے دل چاہ رہا تھا لیکن پناہ گاہ میں وہ اِس شے سے پرہیز کرتا تھا۔

''تمہیں نظریں چرانے کا کوئی نیا مرض لاحق ہوا ہے؟'' سر تھامے کھڑے رضا کو اپنے پیچھے آواز سنائی دی تو پلٹا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے، کڑے تیوروں کے ساتھ اُسے گھور رہی تھی۔ ناک میں پہنی لونگ صبح کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

''میں کیوں نظریں چُراؤں گا؟ بلکہ۔۔۔''وہ رکا۔

''بلکہ ؟''اُس نے بھنویں اچکائیں۔

''اب تو تمہیں سب پتہ چل ہی گیا ہوگا میرے بارے میں۔یقیناً اسی لیے تم کل مجھ سے کوئی بھی بات کیے بنا چلی گئی۔'' وہ اُداسی سے مسکرایا۔اِس الزام پر تو وہ بھونچکارہ گئی۔

''تم نے ہی تو کہا تھا جانے کو؟'' وہ حیران ہوئی۔

''میں نے کہا تھا تو ضروری تو نہ تھا کہ تم چلی ہی جاتی۔پر شاید تم اب مجھ سے۔۔۔۔'' وہ مزید کچھ کہہ رہا تھا۔

''یہ خالصتاً زنانہ ڈائیلاگ ہیں رضاالٰہی !'' وہ سنجیدگی سے بولی تو اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''میرا مطلب۔۔۔''

''بھاڑ میں گیا تمہارا مطلب، تم نے کہا جاؤ تو میں چلی گئی۔دو روز تمہارے انتظار میں پناہ گاہ کا خیال رکھا،اُسکے جواب میں کوئی تشکر آمیز جملہ کہنے کی بجائے، تم نے مجھ سے کہا جاؤ۔واقعی ؟'' وہ شکوے کے سے انداز میں پوچھنے لگی تو اُسے شرمندگی ہوئی۔

''اور اُس پر سے مجھے ہی کہہ رہے ہو کہ میں تمہارے بارے میں یہ سوچوں گی،اور وہ سوچوں گی۔۔۔اور یہ۔۔۔۔یہ فریحہ کیوں اِس طرف آرہی ہے ؟'' بات کرتے کرتے اُس نے یکدم ہی ناگواری سے کہا تو رضا نے حیرت سے دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے وہ داخل ہوتی نظر آرہی تھی۔

''وہ ولید کو لینے آئی ہوگی۔''رضا نے وضاحت دی۔

''تو ولید تو اندر ہی ہے، یہ ہماری طرف کیوں آرہی ہے ؟''

''مجھ سے ملنے آرہی ہوگی۔''

''کیوں ؟اُسے نظر نہیں آرہا کہ میں تم سے بات کررہی ہوں ؟ کوئی اخلاقیات نہیں ہے اُس کے اندر ؟''اُسکے دھونس بھرے انداز پر رضا نے مُسکراہٹ ضبط کی۔اتنی دیر میں فریحہ بھی وہاں پہنچ گئی۔

''عید مبارک رضا !''قریب آکر خوش دلی سے کہا۔

''عید مبارک! اِن سے ملو، یہ جزاہیں۔ ولید کی ٹیچر!''اُس نے فوراً تعارف کروایا۔

''اوہ! تو آپ ہیں۔ رضا بہت تعریف کرتا ہے آپ کی۔''اُس نے کہا تو جزا زبردستی مسکرائی۔

''ولید اندر ہے فریحہ!''رضا نے کہا۔

''ہاں! لیکن مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے پہلے''اُس نے جواب دیا۔

''میں ابھی جزا سے کچھ ضروری بات کر رہا ہوں۔ تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔''اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو وہ فوراً اثبات میں سر ہلاتی اندر چلی گئی۔ جزا کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آئی ایم سوری! میں سمجھا کہ تم اب میرے بارے میں اچھا نہیں سوچتی ہو گی۔''اُس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

''اپنے چھوٹے سے دماغ پر اتنا زور مت دیا کرو۔''اُس نے ناراضگی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''اچھا! میرا ایک کام کر دو گے؟''جزا نے یکدم ہی یاد آنے پر پوچھا۔

''آپ حکم کریں۔''وہ فرمانبرداری سے بولا تو جزا نے اپنے پرس کے اندر سے ایک لفافہ باہر نکالا۔

''کیا عیدی دے رہی ہو؟''اُس نے شرارت سے پوچھا۔

''بالکل نہیں!''اُس نے آنکھیں دکھاتے کہا۔''یہ خط پوسٹ کروا دو گے؟''اُس نے لفافہ رضا کی جانب بڑھایا۔

''اب کہ دور میں کون خط لکھتا ہے؟''اُس حیران ہوتے لفافہ تھاما۔

''میں لکھتی ہوں۔ ویسے میں خود ہی پوسٹ کر دیتی پر بھائی نے غیر ضروری باہر نکلنے سے منع کیا ہے۔''بھائی کی فرمانبردار بہن نے جھوٹ بولا۔

''تو اپنے بھائی سے ہی کہتی پوسٹ کرنے کو۔''اُس نے ازراہِ مذاق کہا۔

''نہیں کرنا تو منع کر دو۔''اُس نے برا مانتے ہوئے کہا۔ اب بھائی کے ہاتھ خط لگتا تو پوسٹ مارٹم ہونے سے قبل کبھی خط ارسال نہ ہوتا۔

''مذاق کر رہا ہوں۔''

''اچھا سنو! ایک بات تو بتاؤ۔'' جزا نے یکدم ہی سنجیدہ ہوتے رازداری سے کہا۔

''پوچھو!'' رضا نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھتے ہوئے تابع داری سے کہا۔

''یہ تم میرے بھائی کے پرانے دوست ہو؟ ہیں نا؟'' اُس نے آنکھیں چھوٹی کرتے ہوئے پوچھا تو رضا حیران ہوا۔

''تمہیں کس نے کہا؟'' اُس نے پوچھا۔

''بھائی نے خود بتایا۔''

''جھوٹ مت بولو!'' رضا کو یقین نہ آیا۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گی؟ میسیج دیکھو بھائی کا۔'' اُس نے فوراً موبائل کھول کر نوید کا میسیج اُسکے سامنے کیا۔

رضا میرا پرانا دوست ہے۔ تم سے زیادہ مجھے اُسکی فکر ہے۔

میسیج پڑھ کر رضا کے چہرے پر ایک اُداس سی مسکان نمودار ہوئی۔

''آ گیا یقین؟'' اُس نے موبائل اُسکے ہاتھ سے واپس لیا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم بھائی کو جانتے ہو۔'' ایسے کہا جیسے دیکھا! پکڑی گئی نا چوری؟

''وہ سب چھوڑو! یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے بھائی کو ایسا کیا کہا جو وہ تم سے کہہ رہا تھا کہ اُسے تم سے زیادہ میری فکر ہے؟'' رضا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ گڑبڑائی۔

''بات مت بدلو! کیوں نہیں بتایا تم نے مجھے کہ تم بھائی کے دوست ہو؟'' اُلٹا اُسی پر چڑھائی کی۔

''ہم یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر کام کے سلسلوں میں الگ ہوئے تو لمبے عرصے تک ملاقات نہ ہوئی۔ بس اُسی روز دوبارہ ملا مجھے، جس روز تمہیں پولیس والوں سے بچانے آیا تھا۔'' اُس نے آدھا ادھورا سچ بتایا۔

''اور وہ باقی سارے لوگ؟ جو تمہیں ڈھونڈتے یہاں تک آئے تھے؟اُن میں سے ایک تو نشمیہ کے فادر (والد) تھے؟''

''ہاں! وہ سب بھی، یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے۔''

''کیا مطلب ساتھ پڑھتے تھے؟ وہ تو کہہ رہے تھے کہ تم پرانے دوست ہو؟اور مزید یہ کہ کام کے سلسلے میں کوئی دوستوں سے الگ نہیں ہوتا۔ سچ سچ بتاؤ! کیا کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا تھا تم سب کا بھائی سے؟'' وہ کریدنے کے چکروں میں تھی۔

''ایک کام کیوں نہیں کرتیں آپ جزائے خیر؟ اپنے بھائی سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟''اُس نے بڑے ادب سے کہا تو جزا کو آگ ہی لگ گئی۔

''تم بتادوگے تو کیا ہو جائے گا؟'' وہ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔

''وہ میرے دوست کا راز ہے، تمہیں کیوں بتاؤں؟'' رضا نے اُسے، اُسی کا کبھی کا کہا گیا جملہ لوٹایا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''اب میں جا رہا ہوں، فریحہ انتظار کر رہی ہو گی۔'' وہ مسکراہٹ ضبط کرتے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

''بھاڑ میں جاؤ!''اُس نے سلگ کر کہا تھا۔

بھلا اب کیسے معلوم ہو گا اُسے کہ نوید اور رضا آپس میں دوست کیسے ہیں؟

----------+---------+--------

چنے سے قد کے ساتھ کھڑی وہ چھوٹی سی چوزی اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اُسکی ماں آج اُسے کسی شہزادی سے کم نہ لگ رہی تھی۔

''امی! آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ میں کیا بتاؤں؟''نشمیہ نے اپنے مخصوص انداز میں آئینے کے سامنے کھڑی، سلیقے سے اپنا دوپٹہ سر پر جماتی فاطمہ کو دیکھ کر تعریف کی۔

''پر میں نشمیہ سے زیادہ پیاری نہیں لگ رہی۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ احمد کا لایا ہوا سوٹ ہی پہنی ہوئی تھی، جو اُس پر خوب جچ رہا تھا۔ ہلکے پھلکے میک اپ کے بعد بھی آنکھوں کے نیچے حلقے اب بھی واضح تھے۔ ہاتھوں میں احمد کی خواہش پر تھوڑی سی مہندی بھی لگوائی تھی۔ اتنی سادگی کے باوجود بھی وہ احمد اور نشمیہ کو دنیا کی سب سے خوبصورت عورت لگ رہی تھی۔

''امی! آپ اب کبھی نہیں روئیں گی نا؟'' نشمیہ نے اسکے گھٹنوں سے لگتے یکدم ہی سوال کیا تو وہ ساکت رہ گئی۔ یہ کیا پوچھا تھا اُس نے؟

''میں کیوں رووں گی؟'' اُس نے نشمیہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مت رویا کریں، ورنہ مجھے بھی رونا آتا ہے۔'' اُس نے روہانسی لہجے میں کہا تو فاطمہ دھک سے رہ گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اکیلے راتوں کو روتی ہے تو نشمیہ سو رہی ہوتی ہو گی، مگر اِس انکشاف پر اُسکا دل دکھا تھا۔

''اب امی کبھی نہیں روئیں گی، کیونکہ میں امی کے پاس ہوں۔'' اِس آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا تو احمد مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

''ہاں! بالکل۔۔۔'' فاطمہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور بازو وا کیے تو احمد بھی اُسکے ساتھ آ لگا۔ اُسکی دنیا مکمل تھی۔

''امی مجھے نیچے اُتاریں۔ جلدی!'' یکدم ہی نشمیہ نے شور مچایا۔

''کیا ہوا؟'' وہ گھبرا گئی۔

''اتاریں نا!'' فاطمہ نے اُسے فوراً نیچے اتارا تو وہ اپنا دوپٹہ گلے میں پیچھے ڈالتے ہوئے، دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اپنے سے لمبے بھائی کے سامنے کھڑی ہوئی۔

''بھائی میری عیدی دو۔'' فوراً فرمائش کی۔

''ہیں؟'' وہ بیچارہ تو اِس مطالبے پر حیران رہ گیا۔ فاطمہ ہنسنے لگی۔

''میں کہاں سے دوں؟'' اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''جیب سے دو۔'' خاصی عقلمند تھی نشمیہ!

''میری جیب میں عیدی نہیں ہے۔'' اُسکی بہن نے جب سے اُسکی زندگی میں قدم رنجا فرمائے تھے، تب سے ہی اُس بیچارے کا ایسے ہی جینا حرام کیا ہوا تھا۔

''جیب میں ہوتی ہے۔''اُس کے باپ کی جیب میں عیدی تھی، دادا کی جیب میں بھی عیدی تھی تو اُسکے بھائی کی جیب میں بھی ہونی چاہیے۔ ہر حال میں!

''میری جیب میں نہیں ہے۔''

''بھائی! تم اتنے بڑے ہو؟ تمہاری جیب میں عیدی نہیں ہے؟''اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں بڑا نہیں ہوں۔''احمد نے تڑپ کر اُسکو دیکھا۔

''پر تم مجھ سے بڑے ہو۔''نشمیہ سے کون جیت سکتا تھا؟

''یہ لو احمد! نشمیہ کو دے دو۔''پیچھے سے فاطمہ نے چند سو کے نوٹ احمد کو تھماتے اُسکی مشکل آسان کی تو اُس نے تشکّر آمیز نظروں سے پہلے ماں کو دیکھا، پھر نوٹوں کو۔

''پر یہ تو اتنے پیسے گم کر دے گی۔''اُسے بہن کی فکر ہوئی۔

''نہیں! میں بابا کو دے دوں گی۔''اُس نے سمجھداری سے کہا تو احمد نے عیدی اُسکے حوالے کی۔

''تم تیار ہو بیٹا؟''اسی لمحے سفیر صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

''جی ابّا!''فاطمہ نے ادب سے جواب دیا۔

''بیٹا! میں چاہتا تھا کہ تمہاری طرف سے ولی، شہیر (فاطمہ کا باپ) خود ہو۔ میں نے اُسے رات کو کافی کالز کی تھیں، پھر میسیج بھی چھوڑا کہ وہ فارغ ہو کر دیکھ لے۔ پر نہ اُس نے میسیج کا جواب دیا نہ پلٹ کر کال کی۔''اُنہوں نے بتایا تو فاطمہ کا دل اور اداس ہوا۔

''وہ مجھ سے ناراض ہیں۔''اس نے آہستگی سے کہا۔

''پر بیٹا تم تو ایک سال سے اُسکے ساتھ ہی رہ رہی تھی نہ؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''ہاں! وہ اجازت بس نشمیہ کی وجہ سے تھی، پر اُنہوں نے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''چلو تم اُداس نہ ہو۔ میں آج تمہارا ولی ہوں۔ ایک نہ ایک دن شہیر بھی تمہیں معاف کر دے گا۔''اُنہوں نے امید دلاتے لہجے میں کہا تو وہ بس مسکرا ہی سکی۔

''میں تھوڑی دیر میں تمہاری رضامندی لینے اور نکاح نامے پر سائن کروانے آؤں گا۔ ٹھیک ہے!''اُنہوں نے بتایا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''احمد! تم بابا کے پاس نہیں جاؤ گے؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''نہیں! میں امی کے ساتھ ہی رہوں گا۔''اُس نے آرام سے کہا۔

''میں جا رہی ہوں بابا کے پاس۔''اُنکے کچھ بھی کہنے سے قبل نشمیہ اعلان کرتی ہوئی بھاگ نکلی۔

''نشمی! سیڑھیوں پر آہستہ سے چلنا۔''پیچھے سے فاطمہ نے تلقین کی تھی۔ ماں کی تلقین سن کر اُس نے قدم آہستہ کیے، پھر آرام آرام سے سیڑھیاں اترتی نیچے آنے لگی۔ لاؤنج میں علی، عمر سے عید مل رہا تھا۔ اُنکے خاندان کے کچھ قریبی لوگ بھی موجود تھے۔ کچھ چہ مگوئیاں بھی چل رہی تھیں، پر علی کو مطلق پروا نہ تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم آئے۔''علی نے عمر سے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے بلایا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بابا! میں تھک گئی۔''آدھی سیڑھیوں پر کھڑی نشمیہ نے باآواز بلند پکارا تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

''اتنی سی سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہی تم تھک گئی؟''اُس نے وہیں سے پوچھا۔

''میں چھوٹی ہوں نا!''اُس نے اپنا مسئلہ بیان کیا تو عمر ہنسا۔ علی جا کر اُسے گود میں اٹھا کر لے آیا۔

''عید مبارک انکل!''نشمیہ نے عمر کو دیکھ کر خوشی سے کہا۔

''عید مبارک! کیسی ہو نشمیہ؟''عمر نے پیار سے پوچھا۔

''میں اچھی ہوں۔''اُس نے زور وشور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ توتم بالکل ہو۔''وہ ہنسا، پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا۔''یہ لو! تمہاری عیدی۔''اُس نے لفافہ نشمیہ کی جانب بڑھایا۔

''تھنک یو!''اُس نے لفافہ لیتے ہوئے کہا، پھر علی کی جانب بڑھایا۔

''یہ لیں بابا! یہ والا بھی آپ کا۔''اُس نے کہا۔

''اوہ! کرپشن؟''عمر نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں! یہ میں نشمیہ کو واپس کر دوں گا۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں! واپس نہیں کریں گے۔ بابا نے کہا ہے کہ میں ساری عیدی بابا کو دے دوں۔ پھر وہ مجھے ڈول ہاؤس لا کر دیں گے۔''اُس نے فوراً باپ کا راز فاش کیا۔

''نشمی! ایک بات تو بتاؤ۔''علی نے اُسے گود سے اتارتے ہوئے صوفے پر بٹھایا، اور خود اُسکے سامنے بیٹھا۔ عمر بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''تمہارے پاس زبان کتنی ہے؟''علی نے اُس سے پوچھا۔

''ون (ایک)!''اُس نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے بتایا۔

''اور کان کتنے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''ٹو (دو)!''اب کہ دوسری انگلی بھی اُٹھادی۔

''کبھی تم نے سوچا ہے کہ تمہارے پاس ہر چیز دو ہیں، یعنی دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، دو ہونٹ، دو نوسٹر یلس (نتھنے) لیکن زبان ایک ہی ہے؟ کیوں؟''علی نے پوچھا۔

''کیوں؟''اُسے بھلا کیوں معلوم ہو گا؟

''جو چیز ہمارے پاس زیادہ ہوتی ہے نا، ہم اُسکا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ پر جو چیزیں ہمارے پاس کم ہوتی ہیں، اُسکا استعمال کم کرتے ہیں تا کہ وہ جلدی ختم نہ ہوں۔ تو تمہارے پاس کان دو اِس لیے ہیں تا کہ تم کانوں کا استعمال زیادہ کرو، اور زبان ایک اِس لیے ہے تا کہ زبان کا استعمال کم کرو۔ تو تم سنو زیادہ اور بولو کم۔'' اُس نے پوری سنجیدگی، اور خاموشی کے ساتھ اپنے باپ کا لیکچر سنا۔ عمر دلچسپی سے اُسکے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

''ہاں پر میری زبان میرے دونوں کانوں سے زیادہ بڑی ہے۔'' معصومیت سے دیئے گئے اِس جواب پر جہاں علی بھونچکارہ گیا تھا، وہیں عمر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''کہیں سے لگتا ہے کہ یہ میری اولاد ہے؟'' علی نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ نشمیہ لطیفہ سنانے کے بعد ایسے ہنس رہی تھی جیسے اُسے بڑا سمجھ آیا ہو کہ اُس نے کیا بولا ہے؟ پر جب عمر ہنس رہا تھا تو اُسکا ہنسنا بھی بنتا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب نوید آتا دکھائی دیا۔ سفید شلوار کرتے میں، سیاہ پشاوری سینڈل پہنے، سرمئی وسیاہ بالوں کو سلیقے سے سیٹ کیے، وہ ابھی دروازے سے داخل ہی ہو رہا تھا کہ عمر کے منہ سے بیساختہ ماشاءاللہ نکلا۔ اُسکی آواز صرف علی ہی سن سکا تھا۔ نوید آگے آنے کے بجائے دروازے پر ہی رک گیا، اب وہ سفیر صاحب سے سلام دعا کر رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے حسین یہاں ہوتا تو کیا کہتا؟'' علی نے نوید کو نظروں میں رکھتے ہوئے، عمر سے پوچھا۔

''وہ کہتا کہ ایس ایس پی صاحب فضول میں پولیس کی نوکری میں وقت برباد کر رہے ہیں، انکو تو ماڈلنگ کرنی چاہیے۔'' عمر نے جواب دیا تو دونوں دل کھول کر ہنسے۔ اُنکے ہنسنے پر نوید نے دور سے بھنویں اُچکا کر سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔ اُسکے لمبے قد، کسرتی جسامت پر سفید شلوار کرتا جچ رہا تھا، چہرے پر چھائی بلا کی سنجیدگی کے باوجود، لاؤنج میں کھڑے ہر شخص نے چہرہ موڑ موڑ کر اُسے دیکھا ضرور تھا۔ نظر نہ لگے ایس ایس پی صاحب کو، ماشاءاللہ!

سفیر صاحب سے مل کر وہ اُن دونوں کے پاس آیا۔

''السلام علیکم!'' اُس نے دونوں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! عید مبارک نوید!'' عمر نے کھڑے ہو کر اُسے گلے لگایا۔ اُسکے بعد علی بھی اُس سے عید ملا۔

''عید مبارک!'' نوید کے چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔ کچھ دیر بعد نکاح کی کارروائی کے لیے تمام لوگ جمع ہوئے تو نشمیہ نے رونا ڈال دیا کہ وہ علی کے ساتھ ہی بیٹھے گی۔

''تم میرے ساتھ آجاؤ نشمیہ!'' عمر کی پیشکش تو وہ فوراً قبول کرتی تھی۔ آخر کو وہ اُسکی گڈ بک میں جو تھا۔ فوراً اُسکے پاس آگئی تو عمر نے جگہ کی کمی کے باعث اُسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

''آپ بہت سوئیٹ ہیں۔'' اُس نے تعریف کرنا ضروری سمجھا تو وہ ہنسا۔

''آہ! کاش کہ کبھی میں بھی اپنے لیے یہ جملہ سن لوں۔'' ساتھ بیٹھے علی کے کان اِدھر ہی لگے ہوئے تھے۔ سو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا ضروری سمجھا۔

سفیر صاحب فاطمہ کی رضامندی لے آئے تھے۔ احمد کسی سمجھدار بڑے کی طرح تمام وقت فاطمہ کا بایاں ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ جب رضامندی دینے کے بعد فاطمہ کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہوئے تو اُس نے انہیں اپنے ہاتھوں سے پونچھا تھا۔

''مت روئے امی! اب آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔'' وہ ماں کو معصومیت سے تسلی دے رہا تھا۔ کتنا سمجھدار تھا نہ وہ؟ فاطمہ نے اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

دوسری جانب دورانِ نکاح، نشمیہ مستقل عمر کا سر کھاتی رہی تھی اُسے ہر بات، اور ہر عمل کا مطلب جاننا ضروری تھا۔ عمر بھی بنا ماتھے پر شکن لائے اُسے آہستہ آواز میں بچوں کی طرح سمجھاتا رہا تھا۔ علی گاہے بگاہے ایک آدھ نظر اُن دونوں پر ڈال لیتا۔ خطبے کے دوران بھی عمر نے اُسکے دونوں ہاتھ پکڑ کر دعا کے انداز میں اُٹھا لیے۔

''اب تم دعا مانگو۔ مگر آہستہ آواز میں۔'' عمر نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''کیا ڈول ہاؤس مانگوں؟'' ایک تو یہ ڈول ہاؤس کی دیوانی!

''جو دل چاہے مانگو۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ علی اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

کیوں؟وہ(عمر کی بیٹی)تمہارے ساتھ نہیں رہتی؟

نہیں!اُسکی ماں اُسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔

وہ عمر کے چہرے پر موجود ایک تڑپتے باپ کا انتظار دیکھ سکتا تھا۔گواہان تو اور بھی ہو سکتے تھے،پر اُس نے عمر کو بلایا ہی اِس لئے تھا تاکہ وہ نشمیہ سے مل سکے۔جب سے اُس نے بتایا تھا کہ نشمیہ کو دیکھ کر اُسے اپنی بیٹی یاد آتی ہے۔تب سے اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نشمیہ کو عمر سے ملواتا رہے گا۔

لیکن۔۔۔

وہاں ایک ہی تڑپتا باپ نہیں تھا۔۔۔

کوئی اور بھی تھا،جسکا چہرہ تو سنجیدہ تھا۔۔۔

پر آنکھوں میں چھائی باپ کی شفقت صرف نشمیہ کے لیے تھیں۔۔۔۔

وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

کچھ محبت سے۔۔۔۔

کچھ حسرت سے۔۔۔۔

نوید عالم بھی تو ایک باپ تھا۔۔۔

----------+---------+--------

دن ہفتوں میں،اور ہفتے مہینوں میں کیسے بدلتے ہیں؟کبھی کبھار پتہ بھی نہیں چلتا۔

عید گزرے ڈیڑھ ہفتہ ہونے والا تھا۔چاند آج پوری آب وتاب سے روشن تھا۔آفس کی عمارت کے احاطے میں بنے باغ میں بیٹھا اے ایس پی شیراز، گھٹنوں پر گٹار رکھے، دونوں بازو اُسی پر ٹکائے، چاند کو دیکھ رہا تھا۔دل عجیب اُداس سا تھا۔اُس نے کچھ سوچ کر گٹار کی تاریں چھیڑیں تو فضا میں خوبصورت سا ساز بکھیر گیا۔

ہاتھوں میں چائے کی ڈسپوزیبل پیالی پکڑے، عمارت کی کھلی راہداری سے گزرتا نوید عالم اِس دھن پر ٹھٹک کر رکا۔دھن بجانے والا رک چکا تھا، پر نوید عالم کی نگاہوں نے عمارت کی کھلی راہداری میں کھڑے کھڑے ہی اُسے تلاشا تھا۔اور پھر وہ اُسے باغ کے کسی کونے میں بیٹھ کر گٹار کو پر سوچ نظروں سے دیکھتا نظر آیا۔نوید نے گہری سانس لیکر ستون سے ٹیک لگائی اور چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے اُسے دیکھنے لگا۔

''ہمم مم م۔۔۔''اُس نے ایک مرتبہ پھر گٹار پر دھن چھیڑی اور اِس مرتبہ ساتھ میں خود بھی گنگنانے کی کوشش کی۔پر دھن ساز کو اپنی دھن پسند نہ آئی تو دوبارہ رک گیا۔

''اِسکو کونسے دورے پڑے ہیں اب؟''نوید بڑبڑایا۔

''عشق ہوا ہے تازہ تازہ!''جواب برابر سے آیا تو اُس نے چونک کر دیکھا۔اے ایس پی فیصل وہیں کھڑا تھا۔

''تم واپس کب آئے؟''پچھلے ایک ماہ سے وہ ٹانگ ٹوٹنے کے باعث چھٹی پر تھا۔لٰہذا اب اُسے سامنے دیکھ کر نوید کا حیران ہونا بنتا تھا۔

''آج ہی سے دوبارہ جوائن کیا ہے۔''فیصل نے مُسکراتے ہوئے کہا تو اُس نے بغور اُسے دیکھا، پھر اپنی چائی کی پیالی اُسکی طرف بڑھائی۔

''اسے پکڑو ذرا!''اُس نے کہا تو فیصل نے پیالی تھامی۔

''اِس میں موجود چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں گرنا چاہیے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا، اِس سے پہلے کہ فیصل اِس مطالبے کو سمجھ پاتا، نوید نے اُسکا بایاں بازو پکڑا اور موڑ کر اُسکی پیٹھ کے پیچھے لا جکڑا۔

''آہ۔۔۔''اِس اچانک افتاد پر فیصل کی چیخ نکلی۔

''چائے نہیں گرنی چاہیے میری!''نوید نے حکم دیا تو بیچارے نے کراہتے ہوئے دائیں ہاتھ میں تھامی پیالی کو سنبھالا۔

''سر! میں نے کیا کیا ہے آخر؟'' وہ منمنایا۔

''ٹانگ ٹوٹنے کا تو بہانہ تھا، ایک مہینے سے میری جاسوسی کر رہے تھے؟ تمہیں کیا لگا میں گدھا ہوں جو مجھے معلوم نہیں ہوگا؟'' نوید نے اُسکا ہاتھ کچھ اور مروڑتے ہوئے پوچھا۔

''آہ سر۔۔۔اللہ کی قسم میری ٹانگ ٹوٹی تھی، جاسوسی تو بس ایک ہفتے ہی کی تھی۔'' اُس نے کراہتے ہوئے وضاحت دی۔ راہداری سے گزرتے دیگر عملے نے یا تو مسکرا کر دیکھا تھا، یا نظر انداز ہی کیا تھا۔

''ایک ہفتے بھی کیوں کی؟'' نوید چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔

''سر! آپکے بھائی نے کہا تھا۔'' اُس نے بلآخر سچ اگل دیا تو نوید نے اُسکا ہاتھ چھوڑا۔ وہ بازو جھٹکتے پیچھے ہوا۔

''چائے دو!'' نوید نے حکم دیا تو اُس نے پیالی اُسکے حوالے کی۔

''اتنی بری جاسوسی؟ مجھ سمیت شیراز کو بھی پہلے دن ہی معلوم ہو گیا تھا۔ اس طرح کرتے ہو تم دشمنوں کی جاسوسی؟'' نوید نے گھرکا۔

''آپ میرے دشمن نہیں ہے نا!'' اُس نے بازو سہلاتے ہوئے وضاحت دی۔ اُسی لمحے، دور، اِس تمام کارروائی سے انجان بیٹھے شیراز کی مترنم آواز فضا میں بلند ہوئی تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کوئی بالی ووڈ کا گانا گا رہا تھا۔

''لگتا ہے اِسکی عقل بھی ٹھکانے لگانی پڑے گی۔'' نوید نے تاسف سے کہتے کاریڈور سے اتر کر باغ کی گھاس پر قدم رکھے۔ باغ میں بیٹھا شیراز گٹار کی دھن پر ترنم کے ساتھ گا رہا تھا۔

ذرا کبھی میری نظر سے خود کو دیکھ بھی

اپنے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی فاطمہ آنکھوں میں تشکّر آمیز جذبات لیے علی کو دیکھ رہی تھی، جو ہر شے سے انجان ابھی ابھی اُسکے کمرے میں آیا تھا تا کہ اُسکی دوائیں وغیرہ رکھ سکے۔

اُسکی ہزار کوتاہیوں، خطاؤں اور غلطیوں کے باوجود، علی سفیر نے ماضی کا ایک لفظ بھی نہ دہرایا تھا۔ وہ باقاعدگی سے اُسکا علاج کروا رہا تھا۔ احمد، فاطمہ کے ساتھ ہی رہتا تھا، علی روز آفس سے آ کر ایک چکر اُسکے کمرے کا لگاتا، احمد سے پوچھتا کہ اُسکی ماں نے اپنے کھانے پینے اور

دواؤں کا خیال رکھا؟ وہ سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دیتا تو علی مطمئن ہو کر واپس چلا جاتا۔ فاطمہ کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔ اب وہ لوگ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، ایک ہی میز پر، ایک خاندان کی طرح۔ اور فاطمہ کو یہ ماننے میں کوئی عار نہ تھی، کہ اِس میں کہیں نہ کہیں علی کی اعلیٰ ظرفی بھی شامل تھی۔

ہے چاند میں بھی داغ پر، نہ تجھ میں ایک بھی

چاند کو بغور دیکھتا شیراز ارد گرد سے بے نیاز گا رہا تھا۔ نوید قدم قدم اٹھاتے اُسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اپنے گھر میں، اسٹڈی روم کی میز صاف کرتی نوید کی بیوی، میز پر رکھی اُسی کی تصویر کو ہاتھ میں لیے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ساری دنیا نے اُسے چھوڑ دیا، پر اِس شخص نے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ذہنی مریضہ بن چکی تھی، پاگل ہو چکی تھی۔ پر نوید نے اُسے تب بھی نہ چھوڑا، اُسے احساس بھی نہ ہونے دیا۔ اُس نے اپنی وفاداری کا پورا پورا ثبوت دیا تھا۔ اُس نے ہر قدم اُسے سہارا دیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی نوید نے اُسے ایک سماجی ادارے میں سماجی کارکن کے طور پر بھرتی کروا دیا تھا۔ وہ وہاں چھوٹے چھوٹے یتیم اور بے سہارا بچوں کے ساتھ دن کے کچھ گھنٹے گزارتی تھی۔ اُسکی صحت پر بہت اچھا اثر پڑ رہا تھا۔ اُسے یہ ماننے میں کوئی عار نہ تھی کہ اسکا شوہر ایک اعلیٰ ظرف انسان تھا۔

خود پے حق میرا، تیرا حوالے کر دیا۔

شیراز گانا ختم کرنے ہی والا تھا کہ کوئی اُسکے سر پر کھڑا ہو کر زور سے کھنکارا تھا۔ وہ یہ آواز بہت اچھے سے پہچانتا تھا لہٰذا گانا ختم کرنے سے پہلے ہی اِس بری طرح ہڑبڑایا کہ گٹار گرتے گرتے بچا۔

"سر آپ؟" وہ جلدی سے گٹار تھامے کھڑا ہوا۔

"مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تم اتنا اچھا گاتے ہو؟" نوید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اس مسکراہٹ سے شیراز بخوبی آگاہ تھا، فوراً تھوک نگلا۔

"بس سر! ایسے ہی وقت گزارنے کے لیے۔۔۔" اُس نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

"ڈیوٹی آورز (کام کے اوقات) کے دوران اے ایس پی شیراز وقت گزرا ای کیا کرتے ہیں۔ واہ!" اُس نے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا تو شیراز نے شرمندگی سے سر جھکایا۔

''اچھاذرا یہ تو بتاؤ! میں نے تم سے کہا تھا کہ آسیہ کھوکھر کی فائل اسٹڈی کر کے اُسکے کی پوائنٹس بناؤ، میرے لیے۔۔۔تو کیا تم نے بنائے؟''اب کے نوید نے سنجیدگی سے پوچھا تو شیراز کی ہوائیاں اُڑی۔

''سس۔۔۔سر وہ میں۔۔۔بس کرنے ہی والا تھا۔۔۔''

''ہاں! یقیناً۔۔۔تم کرنے ہی والے تھے، لیکن سوچا پہلے تھوڑی وقت گزاری کرلوں؟ ہیں نا؟''اب کہ شیراز نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔نوید چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر ہاتھوں میں تھامی چائے کی پیالی کو اُسکے سر پر رکھا۔

''اِس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں گرنا چاہیے۔''اُس نے پیالی کی طرف اشارہ کر کے کہا، پھر کلائی میں بندھی گھڑی کی جانب دیکھا۔

''ڈیڑھ منٹ ہیں تمہارے پاس، ڈیڑھ منٹ کے اندر فرخ صاحب کے کمرے میں آؤ، گٹار سمیت!''

''سر آئی ایم سوری!''وہ منمنایا۔

''انہیں بھی تو معلوم ہو کیسے کیسے ہیرے چھپائے ہوئے ہیں انہوں نے۔''وہ اپنی ہی کہتے آگے بڑھ گیا۔

''سر۔۔۔''شیراز نے روکنا چاہا۔

''چائے گرنی نہیں چاہیے۔''اُسکی آواز کانوں میں پڑی تو ہاتھ مل کر رہ گیا، دور کھڑا افصل اُسکی دُرگت بنتے دیکھ ہنس رہا تھا۔

شیراز بخوبی جانتا تھا کہ اگر وہ ڈیڑھ منٹ میں فرّخ صاحب کے کمرے میں نہیں پہنچا تو اُسکا حال برا ہو گا، اور اگر چائے گری تو بھی۔۔۔

----------+---------+--------

ڈیڑھ ماہ اتنی تیزی سے گزرے کے معلوم ہی نہ ہوا۔حج کا مہینہ قریب تھا۔مقدّم نے مقدّس کے ماں باپ سے ملاقات کر کے اُنکے تمام خدشے دور کر دیئے تھے۔وہ نہ صرف بخوشی راضی ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے اُسکی اور مقدّس کی منگنی بھی کر دی تھی۔مقدّم نے جب یہ خبر عمر کو دی تو در حقیقت خوشی سے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں بتا نہیں سکتا کہ میں تمہارے لیے کتنا خوش ہوں؟''عمر نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ تم ہمیشہ ہی میرے لیے خوش ہوتے ہو پر عمر۔۔۔'' مقدّم رکا۔

''کیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''تم اپنے ماں باپ کو سب سچ بتا دو۔ پلیز! اب بتا دو۔'' مقدّم نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ خاموش رہا۔

''تم جانتے ہو کہ جلد ہی ایف آئی اے پلان بی پر عمل درآمد کرنے والا ہے۔ کسی بھی وقت ہمیں بلا لیا جائے گا۔'' مقدّم نے کہا۔

''میں بتانا چاہتا ہوں۔ بس میرے لیے دعا کرنا۔'' اُس نے سر جھکاتے ہو کہا۔

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہمیشہ ہیں۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ پھر اُس سے مل کر وہ گھر کے راستے پر نکل پڑا۔ سارے راستے وہ خود کو تیار کرتا رہا، کہ وہ کس طرح اور کس وقت اپنے ماں باپ کو سچ بتائے گا؟

پر نہ کوئی سرا ہاتھ آیا، نہ کوئی حل سمجھ آیا اور نہ ہی ہمت ہو سکی۔ بلآخر گھر کے باہر گاڑی روکتے ہوئے، وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایف آئی اے کے پلان بی پر عمل درآمد سے ایک روز قبل وہ والدین کو سب سچ بتا دے گا۔

گاڑی سے اتر کر ابھی دروازہ بند ہی کیا تھا کہ جیب میں موجود موبائل بجا۔ یہ مخصوص ٹون اُس نے مائیکل والے گروپ کے لیے لگائی ہوئی تھی، تاکہ کوئی بھی فوری اطلاع اُس سے رہ نہ جائے۔

جیب سے موبائل نکالا تو گروپ پر حسین کا میسیج نظر آ رہا تھا۔ وہ میسج کھولتا، موبائل پر نگاہ رکھے آگے بڑھنے لگا۔

''لوگ شادیاں کر رہے ہیں، منگنیاں کر رہے ہیں، اور ہمیں جھوٹے منہ پوچھ بھی نہیں رہے۔'' حسین کا میسیج تھا، ساتھ بیزار سا منہ بنائے، آنکھیں اوپر چڑھائے ہوئے ایموجی بھی تھا۔ میسیج پڑھ کر عمر مسکرایا، جانتا تھا کہ طنز کا نشانہ کس کس کو بنایا گیا ہے۔

''میرا معاملہ اچانک تھا۔ اس لیے معذرت!'' علی کا معذرت خواہانہ جواب موصول ہوا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رکا اور لان میں بنے چند اسٹیپس پر ہی بیٹھ گیا۔

''معذرت قبول نہیں ہے۔'' حسین کا روٹھا روٹھا سا جواب۔

''میں نے مناسب نہیں سمجھا۔'' یہ منہ چڑاتا جواب مقدّم کا تھا۔ عمر ہنسا، پھر یہی ہنسی والا ردعمل اُسکے میسیج پر بھی دے دیا۔

''نہ قبول کرو۔'' یہ مزید تپانے والا جواب، علی نے اُسکے پچھلے میسیج پر دیا تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' حسین نے لکھا اور اگلے ہی لمحے گروپ لفٹ کر دیا۔ عمر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔اُس نے واقعی گروپ لفٹ کر دیا تھا۔

''اِس نے گروپ لفٹ کر دیا؟'' عمر نے میسیج ٹائپ کیا۔

''ڈرامے کر رہا ہے۔'' کافی دیر سے غائب رضا نے جواب دیا تھا۔یعنی وہ بھی تمام میسیج پڑھ رہا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے ایک اور نوٹیفکیشن موصول ہوئی۔

"Naveed Aalam added Hussain Murtaza"

(نوید عالم نے حسین کو گروپ میں شامل کیا ہے)

عمر ہنسا، یعنی نوید بھی ساری بکواس پڑھ رہا تھا؟

''اب تم لوگ اتنی معذرت کر ہی رہے ہو تو میں قبول کرتا ہوں۔ جاؤ معاف کیا۔'' غالباً حسین کا غصّہ اُتر چکا تھا۔

''احسان کرنے کا شکریہ!'' یہ جواب علی کا تھا، جبکہ مقدّم نے فقط منہ چڑاتے ایموجی بنا کر بھیجے تھے۔

عمر مسکرایا، فضا میں دوستی کی مہک پھر سے زندہ ہونے لگی تھی۔ زندگی میں کمیاں پھر سے پوری ہونے لگی تھیں۔

ہر شے آہستہ آہستہ جگہ پر آ رہی تھی۔۔۔

یا زندگی نئے امتحان کے لیے تیار کر رہی تھی؟

----------+---------+--------

علی الصبح وہ تیار ہو کر آفس پہنچا تو اسکے انداز میں نہ کوئی عجلت تھی نہ جلد بازی۔ سکون کے ساتھ وہ اپنے کل کے ادھورے کاموں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ عمر دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آیا۔

''علی!'' اُس نے اپنی میز کا سامان یہاں وہاں کرتے عجلت میں اُسے پکارا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے رک کر حیرت سے دیکھا۔

''ہماری پورٹ فولیو کی فائل کہاں ہے؟''اُس نے درازیں کھنگالتے ہوئے پوچھا۔

''سامنے ریک میں رکھی ہے۔پر تمہیں کیا ہو گیا اچانک؟''علی نے کہتے ہوئے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔وہ ریک کی طرف آیا اور فائل ڈھونڈنے لگا۔

''یار! صبح میری ایک جاننے والے سے بات ہوئی ہے۔وہ اپنے آفس کا انٹیریئر کروانا چاہتے ہیں اور بس فوراً ہی آ رہے ہیں ملنے کے لیے۔'' اُس نے فائلیں ڈھونڈتے ہوئے بتایا۔

''ارے ایسے کیسے آ رہے ہیں؟ وہ بھی اچانک؟ کوئی اپائنٹمنٹ ہی نہیں لیا تو پھر میٹنگ کیسی؟''علی کو اس اچانک افتاد کی سمجھ نہ آئی، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یار! وہ میرے توسط سے آ رہے ہیں، اُنہوں نے بہت درخواست کی اِس لیے میں نے منع نہیں کیا۔''عمر کو مطلوبہ فائل مل گئی تو وہ اُسے کھولتے ہوئے قریب آیا۔

''پر عمر! نہ ہماری کوئی تیاری ہے؟ نہ ہمیں انکا کچھ معلوم؟''علی کو فکر ہونے لگی۔

''تم فکر نہ کرو، میں دیکھ لوں گا۔''اُس نے تسلی دی۔

''تو پھر خود ہی دیکھو، مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو؟''علی نے تڑخ کر کہا تو اُس نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تمہارے بغیر تو کوئی ڈیل نہیں ہو سکتی۔''وہ جانتا تھا کہ اُسکا یہی ردِ عمل آنے والا ہے۔

''میرے بنا بلا چکے ہو، تو ڈیل بھی کر لو۔''اُس نے سنجیدگی سے کہتے کرسی گھسیٹی اور واپس بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں کہ مجھے تم سے پوچھ کر، یا کم از کم تمہارے علم میں لا کر میٹنگ (مشاورت) رکھنی چاہیے تھی، پر یہ سب بہت عجلت میں ہوا اور میں اُنہیں آنے سے منع نہیں کر سکا۔''عمر نے وضاحت دی پر علی غالباً ناراض ہو چکا تھا۔اُسکا ناراض ہونا بنتا بھی تھا، اُس نے آج تک عمر کے علم میں لائے بنا کسی کلائنٹ کو مشاورت کے لیے نہیں بلایا تھا۔

''سر! کلائنٹ پہنچ گئے ہیں۔''اِس سے پہلے کہ عمر کچھ کہتا، اُنکے سیکریٹری نے آکر اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے!''عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔''علی! ریسیو (لینے) کرنے تو چلو نا!''اُس نے منت آمیز لہجے میں کہا تو وہ بیزار منہ بناتا کھڑا ہو گیا۔

عمر نے سکھ کا سانس لیا۔اُسے معلوم تھا کہ اُس نے اب مشاورت کے دوران ایک لفظ نہیں بولنا، لیکن کم از کم وہ ساتھ آنے پر راضی ہو گیا یہی بہت تھا۔کلائنٹ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور اُسکے جوان سالہ بیٹے پر مشتمل دو لوگ تھے۔

''السلام علیکم! آپ کو آنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''عمر نے انہیں مشاورتی کمرے کی جانب لے جاتے ہوئے پوچھا، علی کے چہرے پر سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

''نہیں میں آرام سے لوکیشن پر پہنچ گیا، لیکن میں بڑا شرمندہ ہوں کہ اس طرح جلد بازی میں آپکو تنگ کیا۔''آدمی نے خوش اخلاقی سے معذرت کی، پھر ایک نظر خاموش کھڑے علی کو دیکھا۔

''انکا تعارف؟''اُس نے علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو فائل دیکھنے میں مصروف تھا۔

''یہ میرا دوست ہے علی سفیر! اور میرا پارٹنر بھی ہے۔کاروبار کا پچاس فیصد شیئر ہولڈر۔''عمر نے سنجیدگی سے تعارف کروایا، تو علی نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا جو کلائنٹ سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

''اچھا اچھا! آپ نے بتایا تھا انکے بارے میں۔کیسے ہیں آپ علی صاحب؟''اُنہوں نے علی سے پوچھا۔

''الحمدُ اللہ! ابھی میں آپکے آفس کی فائل کا مطالعہ ہی کر رہا تھا فرقان صاحب! جگہ تو کافی اچھی ہے۔''اُس نے یکدم ہی خوش اخلاقی کے تمام ریکارڈ توڑے تو عمر نے حیرت سے اُسکو دیکھا۔اُسکے بعد مشاورت کے دوران بھی اُس نے بہترین اخلاق کا مظاہرہ کیا کہ کلائنٹ نہ صرف خوش ہو کر گئے بلکہ ڈیل بھی فائنل ہو گئی۔دونوں انہیں چھوڑنے کے لئے پارکنگ تک آئے۔حالانکہ وہ ایسا کرتے نہیں تھے لیکن کلائنٹ چونکہ عمر کا شناسا تھا، لہٰذا اس طرح کیا گیا۔

''میں کیا سوچ رہا ہوں کہ اِس سے پہلے کہ ایف آئی اے ہمیں بلائے، میں ایک ٹیم کو فرقان صاحب کے کام کے لیے مختص کر دوں۔''

اُنکے جانے کے بعد عمر نے پارکنگ میں اپنے ساتھ کھڑے علی سے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ انکا کام بھی آسان ہے، ٹیم سمجھ جائے گی۔'' علی نے تائید کی۔

''ایک بات بتاؤ!'' عمر نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم تو مجھ پر غصّہ نہیں تھے ابھی؟'' اُس نے یاد دلایا۔

''بالکل تھا۔'' علی نے تردید نہیں کی۔

''تو یہ اچانک سے غصّہ کہاں گیا؟''

''اُتر گیا۔'' وہ مُسکرایا۔

''کب؟''

''جب تم نے مجھے دوست کہا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے عمر کو دیکھا اور پھر اُسے حیرت زدہ سا چھوڑتے کندھے اُچکاتا عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

عمر چند لمحے منہ کھولے اُسے جاتا دیکھتا رہا، پھر یکدم ہی مُسکرا دیا۔

----------+---------+--------

جو وہ دیکھ رہی تھی وہ ایک نیا منظر تھا۔ اُسکی بتیس سالہ زندگی کا پہلا منظر۔۔۔

جو وہ سن رہی تھی اُس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ بہت مشکل۔۔۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم مذاق کر رہے ہو نا کوئی؟ ہے نا؟'' اسے اپنے سوال پر خود بھی یقین نہ تھا۔ حسین نے سرخ آنکھیں اور سنجیدہ چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ یہ منظر حور نے اپنی بتیس سالہ زندگی میں واقعی پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ اتنا تو کبھی بھی نہیں۔

''اِس بار میں مذاق نہیں کر رہا حور عین!''اُس نے آہستگی سے کہا۔ وہ صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ حور عین تیزی سے اُٹھی اور اسکے سامنے رکھی میز پر بیٹھ گئی۔

''حسین! کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے نا؟ کوئی تمہیں کیوں مارنا چاہے گا؟ تم نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، تمہاری تو کبھی کسی سے دشمنی رہی ہی نہیں۔'' وہ ماننے سے انکاری تھی۔

''غلط فہمی نہیں ہے۔ پر تم پریشان نہ ہو۔ مجھے ایف آئی اے پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔'' حسین نے اُس سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔

''میں سمجھتی رہی۔۔۔ کہ شاید۔۔۔ شاید تمہیں اپنے دوست مل گئے۔۔۔ پر یہاں تو۔۔۔''دکھ اور بے یقینی کی وجہ سے اُس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''ہاں! یہ تو سچ ہے، اُس نکمّے قاتل نے مجھے میرے دوستوں سے ملوا دیا۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا۔

''نہیں! حسین۔۔۔ حسین مجھے تایا ابّو کو بتانا ہو گا۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

''نہیں حور! تم خاندان میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ نہ اپنے والدین کو نہ میرے ابّو کو۔''اُس نے سختی سے کہتے اسے روکا۔

''پر حسین۔۔۔''اُس نے مخالفت کرنی چاہی۔

''حور! اِس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، وہ الٹا پریشان ہو جائیں گے۔ دیکھو! میں چار ماہ سے اِس حقیقت کے ساتھ جی رہا ہوں۔ مجھے ایف آئی اے پر بھروسہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کرو۔ کچھ نہیں ہو گا۔ پلیز حور! میرا ساتھ دو اِس مشکل وقت میں۔ جلد وہ پراسرار انسان پکڑا جائے گا، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا، اور وہ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ سب سن رہی تھی۔

پر۔۔۔۔

ابھی تو اُسے۔۔۔۔

ایف آئی اے کا پلان ہی نہیں معلوم۔۔۔

----------+---------+--------

ایف آئی اے کی عمارت میں بنے مشاورتی آفس میں بیٹھا نوید اس وقت کسی گہری سوچ میں تھا، فیصل برابر میں رکھی چھوٹی سی میز پر بیٹھا، سسٹم پر کچھ کام کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھ تو شیراز دروازے پر تھا۔ نوید نے اُسے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔

''سر! آپکے دوست پہنچ چکے ہیں۔'' اُس نے اطلاع دی تو نوید نے دائیں بھنویں اُٹھا کر اسے دیکھا پر کچھ کہا نہیں۔

''اور آپ سے ایک بات بھی کرنی تھی۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے گویا ہوا۔

''کہو!'' نوید نے کاغذات میں سر دیتے سنجیدگی سے کہا۔ شیراز کے کندھوں کے پیچھے نظر آتے دروازے سے، وہ پانچوں اندر داخل ہوتے اور اپنی اپنی نشستیں سنبھالتے دکھائی دے رہے تھے۔

''وہ۔۔۔ میری شادی ہے کل۔'' اُس نے دانت نکالے۔

''تو؟'' نوید کے سنجیدہ سوال پر اُسکی بتیسی اندر گئی۔

''وہ چھٹّی چاہیے تھی۔''

''چھٹّی میں دیتا ہوں یا ڈیپارٹمنٹ؟'' نوید نے صفحات پلٹتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''شادی یکدم ایمرجنسی میں ہو رہی ہے، ڈیپارٹمنٹ سے چھٹّی منظور کروانے کے لیے کم از کم ایک ماہ پہلے درخواست دینی ہوتی ہے۔ اب اتنے شارٹ نوٹس پر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے آپ ہی مجھے رخصت دے دیں۔'' اُس نے بلآخر اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''کتنے دنوں کی رخصت چاہیے؟'' اُس نے چہرہ اٹھا کر اُسے گھورا۔

''گیگ۔۔۔ گیارہ۔۔۔ گیارہ دن۔'' اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''اُس نے بھنویں اُچکاتے پوچھا۔

''ابھی تو بتایا سر! شادی ہے میری۔''

''کونسی شادی گیارہ دنوں تک چلتی ہے؟''اُس نے سینے پر ہاتھ باندھتے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے فرصت سے اُسے دیکھا۔ جواباً شیراز خاموش رہا۔

''تین دن کی رخصت ہے تمہیں!''وہ حتمی انداز میں کہتا واپس کاغذات کی جانب جھکا تو شیراز کا منہ کھل گیا۔

''سر! تین دن تو بہت کم ہیں۔''وہ منمنایا۔

''ٹھیک ہے! دو دن۔۔۔''

''سر پانچ کر لیں۔۔''

''ایک دن۔۔۔''

''رہنے دیں چھٹّی کو میں نکاح یہیں کر لوں گا۔''اس نے تپ کر کہا۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمہیں بہتر لگے۔''

''مجھے شادی ہی نہیں کرنی!''وہ منہ بناتے کہتا وہاں سے چلا گیا۔

''فیصل!''اُسکے جانے کے بعد نوید نے قریب بیٹھے فیصل کو مخاطب کیا۔

''جی سر!''

''شیراز پندرہ دن کے لیے چھٹیوں پر جائیگا، تو تم اُسکے حصّے کی ڈیوٹی پوری کرو گے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔

''پندرہ دن؟''وہ بھونچکارہ گیا۔

''جب تم ایک مہینے سے میری جاسوسی کرنے کے لیے چھٹّی پر تھے، تب تمہارے حصے کی ڈیوٹی اُسی نے دی تھی۔''نوید نے بتایا کم اور جتایا زیادہ تھا۔

''میری ٹانگ ٹوٹی تھی۔'' وہ یہ وضاحت ہزار مرتبہ دے چکا تھا پر کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''کیا سارے گورنمنٹ آفیسر ایسے ہی ہوتے ہیں؟''قریب اپنی نشست پر بیٹھے حسین نے مقدم کے کان میں سرگوشی کی۔

''ایسے یعنی؟'' اُس نے پوچھا۔

''ایسے یعنی، میرے اسکول کی کھڑوس پرنسپل جیسے۔۔۔''اُس نے کہا۔

''پرنسپل کھڑوس نہیں ہوتے۔ وہ بس ذمے دار ہوتے ہیں۔'' رضا کے کان کھڑے ہوئے تھے، لہٰذا فوراً تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''ویسے یہ اتنی ایمرجنسی میں شادی کیوں کر رہا ہے؟ اور کس سے؟''اُنکی بکواس سے بے نیاز نوید نے فیصل سے جیسے یاد آنے پر پوچھا۔

''اُسکے مولوی صاحب کی بیٹی نمرہ قائم خانی سے، اسکی شادی اچانک ہی طے پائی ہے۔''

''وہ جسکے چہرے پر سمیر نے تیزاب پھینک دیا تھا؟''نوید نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہی۔۔۔''فیصل نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔اِس سے پہلے کے وہ کوئی جواب دیتا، مشاورتی کمرے کا دروازہ کھلا اور فرّخ صاحب داخل ہوتے دکھائی دیے۔

''السلام علیکم!''اُنہوں نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تم سب کو آج یہاں بلانے کا مقصد پلان بی کے حوالے سے آگاہ کرنا ہے۔ تم سب مئی کی تین تاریخ کو یہاں آؤ گے، بلکہ لائے جاؤ گے۔'' اُنہوں نے بات کا آغاز کیا۔

''جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ قاتل تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ پہلے خلیل اور پھر اس کیس کا مرکزی کردار مائیکل، ہمارے پاس اب کوئی ایسی شے نہیں بچی، جس سے ہم اُس پُراسرار قاتل تک پہنچ سکیں۔ لہٰذا اب ہمارے پاس فقط پلان بی ہے جو ہمیں یا تو مجرم تک پہنچائے گا، یا نہیں۔ لیکن۔۔۔''اُنہوں نے رک کر سب کے چہرے دیکھے۔

"یہ تو طے ہے کہ تم میں سے کسی کو بھی، میں اُس مجرم کا نشانہ نہیں بننے دوں گا۔ ہم پلان بی کی شکل میں ایک بہت بڑا رسک لے رہے ہیں۔ کیا تم سب اِسکے لیے تیار ہو؟" اُنہوں نے پوچھا تو باقی سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے! تم سب نے تیار رہنا ہے۔ تین مئی کی رات گیارہ بجے۔۔۔" وہ تمام لائحہ عمل اُنہیں بتاتے جا رہے تھے۔ مشاورت سوا گھنٹے تک جاری رہی۔ اُنکے تمام خدشات کو دور کرنے اور تمام سوالات کے جواب دینے کے بعد بلآخر وہ مشاورت برخاست کر کے چلے گئے۔

"کسی کا کوئی سوال؟" نوید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں! کیا تم بھی اِس سارے لائحہ عمل کا حصہ ہو؟" حسین نے پوچھا۔ (اِس آدمی نے قسم نہیں کھائی تھی کہ نوید کو مخاطب نہیں کریگا؟)

"کیوں؟ کیا میری تصویر اُس ڈائری میں نہیں ہے؟" وہ سوال کے جواب میں بھی سوال ہی کرتا تھا۔ حسین بدمزہ ہوا۔

"پر تم تو ایس ایس پی ہو نا!" مقدّم نے بات مکمل کی۔

"میں پاکستان کا اکیلا ایس ایس پی نہیں ہوں۔" اُسکی سنجیدگی میں رتی بھر فرق نہ آیا۔

"یار! میری تلاشِ گمشدہ والی تصویر انٹرنیٹ پر کس نے لگائی تھی؟" رضا نے یکدم ہی برا سا منہ بنا کر پوچھا تھا۔

"میں نے ڈالی تھی، جب تم غائب ہو گئے تھے۔ کیوں؟" نوید نے پوچھا۔

"جب میں مل گیا ہوں تو اُسے اب ہٹوا بھی دو۔ مذاق بن گیا ہے میرا اسٹوڈنٹس میں۔۔۔" اُس نے جس لہجے میں بتایا تھا، سب بیساختہ ہنسے تھے۔

"اچھا سبق مل گیا ہے تمہیں۔" حسین نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

دور بیٹھا شیراز انہیں منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔

یہ لوگ موت کے دہانے پر کھڑے ہنس رہے تھے۔

عجیب لوگ تھے بھائی!

----------+---------+--------

مورخہ تیس اپریل

(تین مئی کی شام سے، ایف آئی اے کے جوانوں کا تمہیں تمہارے گھروں سے لینے کا سلسلہ شروع ہو گا۔ اگر کسی نے تم پر نظر رکھی بھی ہے، تو وہ نہیں جان سکتا کہ گاڑی میں کون آیا، اور واپسی پر گاڑی میں کون کون گیا۔ تم سب نے آنے والی گاڑی کو گھر کے نسبتاً سنسان حصّے میں پارک کروانا ہے۔ گھر کو اندھیرا رکھنا ہے اور کم سے کم سامان لیکر گاڑی میں بیٹھ جانا ہے۔ اُسکے آگے نوجوان کا کام تمہیں محفوظ طریقے سے ایف آئی اے پہنچانا ہے۔ یاد رہے کہ گیارہ بجے آنے والی گاڑی آخری ہو گی۔ ہم مغرب کے بعد سے گاڑیاں بھیجیں گے۔ تم پانچوں کے گھروں میں مختلف اوقات میں گاڑیاں پہنچیں گی تا کہ کسی کو شک نہ گزرے۔ بظاہر ایسا لگے گا جیسے کوئی مہمان ملنے آیا اور چند گھڑی ملنے کے بعد واپس چلا گیا۔)

رضا نے آج جزا کو خصوصاً بلوایا تھا۔ وہ اُس سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا تھا۔ چہرہ ٹھیک ٹھاک سنجیدہ تھا۔

''میں ایک سے ڈیڑھ ماہ کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ میں ایسی جگہ جا رہا ہوں، جہاں سے رابطہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اِس دوران میں پناہ گاہ کی ذمّے داری تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے بتایا تو جزا کا چہرہ فق ہوا۔

''رضا! تم پھر سے۔۔۔۔'' اُس نے انجانے خدشے کے تحت کہنا چاہا۔

''نہیں!'' رضا نے اسکی بات کاٹی۔ ''میں پھر سے کوئی غلط قدم اُٹھانے نہیں جا رہا۔ مجھے واقع ایک ذاتی نوعیت کا کام ہے۔ میں جس جگہ جا رہا ہوں، وہاں سگنلز کا ایشو بھی بہت زیادہ ہے، اس لیے رابطہ مشکل رہے گا۔ پر میں کوشش کروں گا بات کرنے کی۔'' اُس نے آرام سے سمجھانا چاہا۔

''تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟ مجھے سچ بتا دو رضا!'' جزا کو یقین نہ تھا۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں جو سچ ہے۔ میں بس تم سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''

''کہنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ میرے بھی بچے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ غالباً اسے رضا کا آدھی ادھوری بات بتانا برا لگا تھا۔ پر وہ بتا نہیں سکتا تھا۔

(ایف آئی اے پہنچنے کے بعد، ایک دوسرا شخص، تم لوگوں کی ذاتی گاڑیوں کو تمہارے گھروں سے لیکر نکلے گا۔ اس طرح کہ وہ تم پر نظر رکھنے والے ممکنہ شخص کو بھٹکا سکے۔ یہاں سے تم سب کو مورخہ چھے جون تک کے لیے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے گا۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ اس دوران تم میں سے کوئی بھی اپنے گھر والوں سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔ میں جگہ اور مقام تمہیں نہیں بتا رہا۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں، مجبوراً تم سب اپنے کسی قریبی، یا کسی بھروسے کے شخص کو بتا سکتے ہو۔ اور ہم یہ حساس معلومات کسی کو نہیں دے سکتے۔)

''ابّو! امی!'' سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا عمر آج اپنے ماں باپ کو اپنی بات سننے پر قائل کر چکا تھا۔ ماں تو پہلے ہی سننے کو بے تاب تھیں۔ البتہ آج ابّو بھی راضی ہو گئے تھے۔

''میں آپکو آج وہ حقیقت بتانا چاہتا ہوں جو میں دس سالوں سے اپنے دل میں چھپائے پھر رہا ہوں۔ میں اب اِس راز کا بوجھ اور نہیں اُٹھا سکتا۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ آنکھیں آبشار کی صورت آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔۔ یہ اُسکے چہرے پر واضح تھا۔

''مجھے۔۔۔ مجھے ٹیومر ہو گیا تھا۔ ایک مہلک اور جان لیوا ٹیومر۔۔۔۔'' وہ سب بتاتا چلا گیا اور تین نفوس موجود ہونے کے باوجود وہاں موت جیسا سناّٹا چھایا رہا۔ جب سب کچھ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو اسکے ماں باپ پتھر کی مورت بنے بیٹھے نظر آئے۔

''ام۔۔۔ عمر۔۔'' حفیظ صاحب کی زبان سے اسکا نام ادا نہ ہو سکا تھا۔ وہ یہ کیسے بھول گئے کہ انکا یہ فرمانبردار بیٹا کتنا حساس تھا؟

''مجھے معاف کر دیں ابّو! میں نے بہت غلط کیا۔ بہت زیادہ۔۔۔۔ میں نے غلط فیصلہ کیا، میں اتنے عرصے خضر سے دور رہا۔ میں اِس غم سے کیسے نکلوں گا؟ میں ساری زندگی نہیں نکل سکتا۔'' وہ رو رہا تھا۔ بہت بری طرح۔۔۔

(ہم مجرم کا منصوبہ اُسی پر الٹ دیں گے۔ اُس سائیکو پیتھ نے قتل کے لیے چھے تاریخ ماہ جون کا مہینہ چنا ہے۔ اس دوران تمہارے گھر والوں کی اطلاع ہم تمہیں پہنچاتے رہیں گے۔'' فرخ صاحب نے بات مکمل کی تھی۔

''پر ہم وہاں کریں گے کیا؟'' یہ سوال علی کا تھا۔

''وہ تمہیں وہاں پہنچنے کے بعد بتایا جائے گا۔ یہ کیس کا اہم موڑ ہے، ہر بات یہاں نہیں بتائی جاسکتی۔'' اُنہوں نے سنجیدگی سے کہا۔)

''تم روز ایک نیا انکشاف کرتے ہو حسین! اور چاہتے ہو کہ میں تایا ابّو کو کچھ نہ بتاؤں؟'' آج حور عین ہتے سے اُکھڑ گئی تھی۔

''حور! میں نے تم سے کہا نا! میرا ساتھ دو اس مشکل وقت میں۔۔۔'' حسین نے سمجھانا چاہا۔

''کیسے ساتھ دوں؟ مجھے کچھ بتاؤ تو۔۔۔ کیا مجھ پر اتنا بھروسہ نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ اور کب واپس آؤ گے؟'' وہ رو رہی تھی۔

''حور!'' حسین نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔'' اگر ایف آئی اے نے مجھے بتایا ہوتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں تو میں تم سے کیوں چھپاتا؟ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں۔''

''یہ اندھا بھروسہ ہے حسین!'' اُس نے بے بسی سے کہا۔

''میں اکیلا نہیں ہوں، ہم چھ لوگ ہیں۔ اور بھروسہ صرف اللہ پر ہے مجھے۔ یہ میرا راز ہے حور! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے راز کی حفاظت کرو۔'' وہ اُسے راز رکھنے کو کہہ رہا تھا اور وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔ مشکل مرحلہ سر ہو گیا تھا۔

(تم سب نے اپنے تمام کام مکمل کر کے رکھنے ہیں۔ سامان کم سے کم رکھنا ہے۔ موبائل کے علاوہ کسی قسم کا کوئی گیجٹ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ موبائل بھی تم سب گھر سے نکلتے ہی پاور آف کر دو گے۔

''آپ نے کہا کہ ہماری گاڑیاں ممکنہ جاسوس کو بھٹکاتی رہیں گی۔ لیکن کب تک؟ آخر جب ہم اُسے اپنے روزمرہ کے معمولات نمٹاتے نظر نہیں آئیں گے، تو اسے شک نہیں ہو گا؟'' عمر نے پوچھا۔

''بالکل! لیکن تب تک تم لوگ محفوظ مقام پر منتقل ہو چکے ہو گے۔ ویسے ہمیں مکمل یقین ہو چکا ہے کہ کوئی بھی تمہارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ ہم نے پچھلے چار ماہ میں باریک بینی سے تم سب پر نظر رکھی، ہمیں تم لوگوں کے آس پاس کوئی مشکوک حرکت ہوتی نظر نہیں آئی

ہے۔ایسا لگتا ہے قاتل نے ایک تاریخ ڈیسائڈ کرلی ہے،اور وہ اسی تاریخ کو کارروائی کرے گا۔اِسی لیے ہم نے پلان بی ترتیب دیا۔اُسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ چھے تاریخ کو تم اُسے دنیا کے کسی کونے میں نہیں ملو گے۔پھر ہم پہنچیں گے اصل مجرم تک۔"

"اور ہمارے گھر والے؟"حسین نے سب کے منہ کی بات چھینی۔

"اُنکی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔ظاہری طور پر تمہارے گھر والوں سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔اسے تم لوگوں سے مطلب ہے، لیکن پھر بھی ہم تمہارے گھر والوں کی ہر ممکن حفاظت کریں گے۔)

"تو یہ اب تک کی صورتحال ہے۔تمہیں سمجھ آگیا ہو گا کہ میں نے تم سے دوبارہ نکاح کیوں کیا؟میں چاہتا ہوں کہ میرے پیچھے میرے دونوں بچے پریشان نہ ہوں۔خصوصاً نشمیہ۔۔۔انہیں یہی بتانا ہے کہ میں ضروری کام سے شہر سے باہر ہوں۔اور ابّا کو میں سمجھا دوں گا۔" علی نے مستحکم لہجے میں فاطمہ کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا تھا۔اُسکی طبیعت میں کافی بہتری آرہی تھی۔وہ گنگ سی اُسے دیکھے گئی۔

"تم آرام کرو!"تمام بات بتانے کے بعد وہ اُسکا ردعمل دیکھنے کیلیئے رکا نہیں تھا۔فاطمہ پر جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا۔

مورخہ چھے کے ساتھ اب ان تمام لوگوں کی سانسیں جڑ چکی تھیں۔

----------+---------+--------

مورخہ ایک مئی:

"آپ نے مجھے بلایا بھائی؟"نوید آج ملنے آیا تھا۔آتا تو وہ کبھی کبھار امی سے ملنے تھا۔پر آج وہ خصوصاً جزا سے ملنے آیا تھا۔جزا کو بلانے کا کہہ کر وہ لان میں ہی بیٹھ گیا۔لان کی کھلی چھت سے پناہ گاہ کی بالکونی نظر آرہی تھی۔فلحال وہاں کوئی نہ تھا۔وہ بالکنی کو غور سے دیکھ رہا تھا جب جزا لان میں آئی۔

"ہاں!تم سے کام تھا۔بیٹھو!"اُس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔دل الگ دھڑک رہا تھا،پتہ نہیں کیا پوچھنے والا ہے؟

"کچھ لوگ ہیں،جو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔"اُس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے،پڑوس میں نظر آتی بالکونی کی جانب نگاہ رکھتے ہوئے بنا تمہید کے بات شروع کی۔

''قتل؟'' جزا کو زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ بھائی کے لاتعداد دشمن ہیں۔

''اور رضا کو بھی۔۔۔'' بالکنی سے نظریں ہٹائے بنا کہا تو اُس کا سانس رکا۔

''ک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا مطلب؟'' وہ ہکلائی۔

''ایک گینگ۔۔۔ مافیا۔۔۔ یا جو بھی کہہ لو۔ وہ مجھے اور میرے دوستوں، بشمول رضا کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ انکا منصوبہ ہمیں ایک ساتھ جون کی چھے تاریخ کو قتل کرنے کا ہے۔ ہم انہیں دھوکا دینے کے لیے ایک محفوظ مقام پر منتقل ہو رہے ہیں۔ عارضی طور پر۔۔۔'' وہ رکا اور بالکنی سے نظریں ہٹا کر فق چہرے کے ساتھ خود کو دیکھتی جزا کو دیکھا۔

''نہ ہم کسی سے رابطہ کر سکتے ہیں اور نہ درمیان میں آ سکتے ہیں۔ یہ پلان کا حصّہ ہے۔ تب تک کے لیے مجھے۔۔۔۔'' وہ رکا۔ ''مجھے تمہاری ضرورت ہے جزا!'' آخر میں اسکی آواز آہستہ ہوئی۔

''میں نے بشریٰ کو کچھ نہیں بتایا، بتاؤں گا بھی نہیں۔ امی، کو بھی نہیں بتانا ہے۔ صرف تمہیں اِس لیے بتا رہا ہوں کہ۔۔۔۔'' وہ پھر رکا۔

''تم میری بہادر بہن ہو۔ تم حالات کا سامنا کر سکتی ہو۔ تم اُن دونوں کو سنبھال سکتی ہو۔ تم سنبھال لو گی نا؟'' اُس نے پُرامید لہجے میں پوچھا تو جزا کا سر اپنے آپ ہی اثبات میں ہلا۔

''تمہارا شکریہ! میں کل بشریٰ کو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ تم نے میرے راز کی حفاظت کرنی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔ اِس سے زیادہ وہ بات نہیں کرتا تھا، اتنا بھی بہت تھا۔ کھڑے ہو کر اُس نے ایک مرتبہ پھر پناہ گاہ کی اوپری منزل پر بنی بالکنی کو دیکھا۔ جزا بھی کھڑی ہو چکی تھی، اب گم صم سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں کل صبح چھے بجے آؤں گا۔'' اِس بات پر جزا نے حیرت سے اُسکو دیکھا۔

''چھے بجے؟''

''ہاں! کچھ کام ہے۔''

''کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' اُس نے پریشانی سے پوچھا۔

''مسئلہ تو کوئی نہیں ہے۔''اُس نے ایک مرتبہ پھر پڑوسیوں کی خالی پڑی بالکونی کو دیکھا، پھر دوبارہ جزا کو۔''کل ہی بتاؤں گا کہ کیا کام ہے۔''اُس نے ہمیشہ کی طرح اتنی ہی بات بتانی ضروری سمجھی، جتنی اسے مناسب لگی۔

''خُداحافظ!''وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

''بھائی!''جزا نے یکدم ہی پکارا تو وہ پلٹا۔

''کیا؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے۔۔۔کچھ کہنا تھا۔''یہی صحیح وقت تھا۔اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کا۔

''تمہیں تو کہنا نہیں آتا، تم تو خط لکھتی نا؟''سوال تھا کہ ہزار واٹ کا بجلی کا جھٹکا۔اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

''وہ تو۔۔۔وحید بھائی کو۔۔۔''حیرت کی زیادتی سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔نوید کندھے اُچکاتا اسے بھونچکا چھوڑے سکون سے چلا گیا۔

آخر اِس آدمی کو سب پتہ کیسے چل جاتا تھا؟

----------+---------+--------

وہ پناہ گاہ سے نکل رہا تھا اور وہ اپنے گھر سے۔دونوں کا اپنے اپنے گھروں کے دروازوں کے درمیان بنے ستون کے سامنے، آمنا سامنا ہوا۔

''السلام علیکم!''رضا اُسے سلام کرکے، نظریں چراتے جانے لگا پر وہ راستے میں آ گئی۔

''تو تمہیں ذاتی نوعیت کا کام تھا؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا تو رضا نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔سیاہ سوٹ پر، کشمیری کام والی لال رنگ کی چادر سر پر ڈالے وہ سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''تم کس بارے میں بات کر رہی ہو؟''وہ نہیں سمجھا۔

''تم نے کل مجھے کہا کہ تمہیں ذاتی نوعیت کا کام ہے۔ جبکہ تم کسی انجان قاتل سے اپنی جان بچانے کے لیے جا رہے ہو؟'' وہ دبے لہجے میں چیخی تو رضا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''تم مجھے بتا بھی سکتے تھے۔ تم نے بھروسہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں نے بار بار پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ پر تم نے مجھے اس لائق ہی نہیں سمجھا۔'' وہ آواز آہستہ رکھنے کے باوجود بھی لہجے کی سختی چھپا نہیں پا رہی تھی۔ رضا دم سادھے اُسے دیکھنے لگا۔

''جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے ہر شے سے زیادہ مقدم ہوں، تو مجھے لگا تم سچ بول رہے ہو۔ مگر تم جھوٹے ہو، تم ہر بات مجھ سے چھپاتے ہو۔ تم مجھے اِس لائق ہی نہیں سمجھتے۔'' وہ شکوہ کرنے لگی۔ اور رضا ساکت، جامد سا اُسکی آنسوؤں بھری آنکھوں کو دیکھنے لگا۔

''جواب دو! چپ کیوں کھڑے ہو؟'' وہ سوں سوں کرتی، ناک رگڑتی بولی۔

''رحم کھاؤ مجھ پر۔۔۔'' اُس نے التجا کی۔

''ہاں؟'' وہ اِس مطالبے کا مقصد سمجھ نہ سکی۔

''یعنی! اگر تمہارے بھائی نے اِس طرح بیچ سڑک پر تمہیں روتے دیکھ لیا نا! تو جائے وقوعہ پر میری موجودگی کی بنا پر وہ مجھے ہی موردالزام ٹھہراتے ہوئے، پہلے مجھے زمین میں آدھا دفن کریگا، پھر باقی آدھے وجود پر ٹرک چلا کر میرے پرخچے اُڑا دے گا۔'' اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔ جیسے بیچ برسات میں دھوپ نکل آئی ہو۔

دنیا میں قتل ہونے کے ہزار طریقے تھے۔۔۔

پر رضا الٰہی نے اپنے لیے، کاجل بھری اُن دو سیاہ آنکھوں کو چنا تھا۔۔۔

''میری بات کا جواب دو۔'' آنسو پونچھ کر وہ فوراً موضوع پر واپس آئی۔

''تمہارے بھائی نے ہی بتانے سے سختی سے منع کیا تھا۔ ورنہ میں تو پہلے تمہیں ہی بتانے والا تھا۔'' دفاع کا اصول نمبر پندرہ۔۔۔

''بھائی نے مجھے بتادیا ہے۔''اُس نے جتایا کہ دیکھ لو، میں کتنی اہم ہوں۔ رضا مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھے گیا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم دونوں بہن بھائی کے امریکہ وروس جیسے تعلقات ہیں۔''اُس نے شرارت سے کہا۔

''جزا!''اوراِس سے پہلے جزا کچھ کہتی، اُسکے نام کی پکار سنائی دی۔

رضاالٰہی کے پاس اگر کوئی ان دیکھی ماورائی قوت ہوتی، تو وہ کو خود اِس لمحے دنیا سے غائب کرلیتا۔ وہ غیر مرئی ہو جاتا، وہ انجان ہو جاتا۔ کیونکہ پکارنے والا موصوفہ کا بھائی تھا۔ کاش وہ تھوڑی دیر پہلے کچھ اور بات کرلیتا، یہ اُسی کی منحوس زبان کا نتیجہ تھا۔

''جی بھائی!''جزا نے رضا کی پیٹھ کے پیچھے سے جھانکا تو وہ چلتا ہوا آرہا تھا۔ وہی سنجیدہ مگر سپاٹ چہرہ۔ یہ بھلا اچانک کہاں سے نمودار ہوا تھا؟ رضا نے تو پلٹ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ کہیں پتھر ہی نہ ہو جائے۔ نوید قریب پہنچا، ایسے کہ وہ دونوں کے درمیان، دونوں کو بیک وقت دیکھ سکتا تھا۔ رضا نے تھوک نگلا۔

''السلام علیکم!''اُس کو کچھ نہ سوجھا تو مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ نوید نے سنجیدگی سے دیکھتے ہاتھ ملایا۔

''میں بس! مس جزا سے پناہ گاہ کی کچھ ذمہ داریاں ڈسکس کررہا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمیں جانا ہے۔''اُس نے فوراً وضاحت دی۔ اور زندگی میں پہلی باراُس نے بنا پوچھے کسی کو وضاحت دی تھی۔

''تو؟''ایس ایس پی نوید عالم کا سنجیدہ جواب اُسکا حلق خشک کر گیا۔ اُس نے بیساختہ اُسکے دونوں ہاتھ دیکھے۔ دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں تھے۔ اگر جواِس میں خنجر ہوا؟ اوراُس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں نکالا، اور رضا کی آنکھ۔۔۔۔۔

بس! اس سے آگے وہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ فوراً جھرجھری لیکر سوچوں کو جھٹکا۔ اُسکی اِس ابنارمل سی حرکت پر دونوں بہن بھائیوں نے اُسے سرتاپاؤں گھورا تھا۔

''تمہیں جو ڈسکس کرنا تھا وہ کرلیا؟''نوید نے خصوصاً دونوں دروازوں کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے پوچھا۔ ایسے جیسے کہہ رہا ہوں کہ بات کرنے کی یہ کونسی جگہ ہے؟ اب وہ کیا بتاتا کہ جناب ایس ایس پی کی بہن نے ہی یہ جگہ پسند کی تھی۔ رضا کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''آں۔۔۔ہاں!۔۔۔ہاں! کرلی بات۔''اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا مگر مجال ہے جو ایس ایس پی صاحب کی سنجیدگی میں رتی بھر بھی کوئی فرق آیا ہو۔

''تو جاؤ!''لحاظ مروت تو کسی قسم کی رکھتا نہ تھا وہ۔ جزا کے کندھے پر بازو پھیلاتے اُسے اپنے ساتھ لگایا اور بولا۔''مجھے ذرا میری بہن، سے بات کرنی ہے۔''لفظ میری بہن پر زور دیتے، بتایا کم اور جتایا زیادہ تھا۔ جزا نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا تھا۔ اتنے مثالی تعلقات کب سے ہو گئے اُن دونوں کے؟ نوید اب بھی سنجیدہ چہرے کے ساتھ رضا کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں! کیوں نہیں؟ میں چلتا ہوں۔''وہ تیزی سے واپس پناہ گاہ میں داخل ہو گیا حالانکہ اُسے جانا کہیں اور تھا۔ لیکن اِس وقت کوئی رسک نہیں۔۔۔

''تم اندر آؤ ذرا!''اُسکے جانے کے بعد نوید نے جزا سے الگ ہوتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ اُس کا تو کلیجہ حلق میں آ چکا تھا۔ کیا ضرورت تھی بیچ سڑک پر روک کر بات کرنے کی؟ خود کو دل میں کوستی وہ اندر آئی۔

''جی بھائی! آپ اچانک؟''اُس نے دروازہ بند کرتے لان میں کھڑے نوید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چونکہ تم نے بشریٰ اور امی کو سنبھالنے کی حامی بھری ہے تو میں ایک مرتبہ پھر تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں ہے، اگر تم انکار کرنا چاہو تو میں بشریٰ کو سب بتا دوں گا۔''اُس نے کہا۔

''بھائی! میں صبح آپ کو کہہ چکی ہوں کہ میں آپکے پیچھے سب سنبھال لوں گی۔ آپ بھروسہ رکھیں مجھ پر۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! یہ بشریٰ کی دواؤں کی ترتیب ہے۔ وہ خود یاد نہیں رکھ پاتی، میں چاہوں گا کہ تم امی کے ساتھ ساتھ اُسکی دواؤں کے بارے میں بھی ایک بار اُس سے پوچھ لیا کرو۔ اور اُسکی ڈاکٹرز سے سیشن کی آنے والی تمام تاریخیں بھی لکھ دیں ہیں۔ تم دیکھ لینا!''نوید نے ایک صفحہ اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس نے صفحہ تھام لیا۔

''آپ بے فکر رہیں بھائی!''وہ خوش ہوئی۔ بلآخر اُسکا بھائی اُس پر بھروسہ کر رہا تھا۔ بشریٰ کو یہاں چھوڑ کر جا رہا تھا، شاید وہ اُسکے دل میں اپنا کھویا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ واقعی خوش تھی۔

---------+---------+--------

مورخہ دو مئی:

''ان سب باتوں پر یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ مجھے کیا ردعمل دینا ہے؟'' مقدّم کے سامنے، اخلاق ٹھیک ٹھاک پریشان تھا۔

''میں نے تمہیں سچ بتادیا ہے۔ کیونکہ تم سے میں کچھ نہیں چھپاتا۔'' مقدّم نے کہا۔

''ٹھیک ہے! پر مقدّس؟ اُسکو کیا کہو گے؟''

''میں اُسکو فلحال سچ بتانے کی ہمت نہیں کر پارہا۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''پر جب تم سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکے گا، تو وہ سوال تو کرے گی نا؟ پریشان بھی ہو گی۔ تب؟''

''میں نے اُسے یہ کہا ہے کہ میں اپنی ٹیم کے ساتھ، حساس ادارے کے لیے کام کرنے جارہا ہوں۔ ادارے کو اپنی اندرونی بے ضابطگیوں کا پتہ لگانے کے لیے ہماری مدد درکار ہے۔ کنفیڈنشل (خفیہ) معلومات ہیں لہٰذا اسے نہیں بتا سکتا۔''

''اُس نے یقین کیا؟''

''معلوم نہیں کتنا یقین کیا۔ پر اُس نے دوبارہ اِس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ غالباً وہ مطمئن ہو چکی ہو۔''

''مقدّم! یہ سب سن کر میں بہت پریشان ہوں۔ ڈر لگ رہا ہے مجھے۔'' اخلاق بہت پریشان تھا۔

''تم پریشان نہ ہو، کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ ابھی تک نہیں ہوا تو آگے بھی نہیں ہو گا۔ ان شاءاللہ!'' اُس نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

''ان شاءاللہ!'' اخلاق نے بس اتنا ہی کہا۔

''میرے پیچھے کمپنی تم دیکھو گے۔ اور جب میں واپس آؤں گا تو دونوں مل کر کام کریں گے۔'' اُسے اپنے واپس آنے پر پورا یقین تھا۔ پتہ نہیں کیسے؟ پر تھا۔

''مکرم کس کے پاس رہے گا؟''اُس نے پوچھا۔

''مقدّس کے پاس ہی رہے گا۔''اُس نے جواب دیا تو اخلاق نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

----------+---------+--------

جامعہ میں سمسٹر کے امتحانات چل رہے تھے۔ اُسکے بعد چھٹیاں تھیں۔ رضا آج کل صبح کے اوقات میں فارغ تھا، لہٰذا صبح صبح اسکول چلا جاتا تھا۔ کسی قسم کے شور شرابے کی آواز پر اُسکی آنکھیں کھلی، تو پہلے اُس نے کسلمندی سے اُنہیں ملتے وقت دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اسے نو بجے اسکول پہنچنا تھا۔ شور کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ جیسے کوئی مشین چل رہی ہو، یا پھر کوئی دیوار ٹھونک رہا ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھا اور ناسمجھی سے یہاں وہاں دیکھا۔ آواز گھر کے باہر سے آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور جمائی لیتا بالکنی کے بند دروازے پر آیا۔ پردے گرے ہوئے تھے، اُس نے پردے ہٹا کر دیکھا تو لان خالی تھا۔ اپنے لان سے ہوتی نظریں پڑوسیوں کے لان تک گئیں اور وہ ششدر رہ گیا۔

پڑوسیوں کے لان میں لوہے کے لمبے لمبے پائپ نصب کیے جا چکے تھے۔ اب اُن پر سبز رنگ کا دبیز شیڈ لگ رہا تھا۔ بیک وقت کئی مزدور کام کر رہے تھے۔ اور یقیناً کافی پہلے سے کر رہے تھے، جب ہی صبح آٹھ بجے تک آدھے سے زیادہ کام ہو چکا تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس، ایک کونے میں کرسی ڈالے، اپنے دیو قامت قد کے ساتھ ٹک کر بیٹھا نوید موبائل دیکھ رہا تھا۔ گاہے بگاہے ایک آدھ نظر مزدوروں پر بھی ڈال لیتا۔

''یہ ہو کیا رہا ہے؟''رضا کو اس اچانک اقدام کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ اگلے ہی لمحے نوید نے چہرہ اُٹھا کر براہِ راست اُسکی بالکنی کی طرف دیکھا تو اُس نے سکینڈ کے ہزارویں حصّے میں پردے گرائے اور اندر کی طرف ہوا۔

''اُس نے مجھے دیکھ لیا؟''دل اُچھل کر حلق میں آیا۔

''ایسے جھانکنے کا کیا جواز دوں گا میں اُسے؟''شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا اُسکے لیے۔

''کہیں میری وجہ سے ہی تو نہیں لگوار ہا شیڈز ؟'' یہ خیال دل میں آتے ہی نوید کا کیل نما خنجر، اور ایس ایچ او کی آنکھیں یاد آئیں۔ تھوک نگلتے چور نظروں سے بالکنی کے شیشے کے بنے دروازے کی جانب دیکھا، اور اگلے ہی لمحے یاد آیا کہ دروازہ کالے رنگ کا تھا، جس سے اندر کا منظر نظر نہیں آتا تھا۔ یکدم ہی سینے سے سکون کا سانس خارج ہوا۔

''شکر میں دروازہ کھول کر بالکنی میں نہیں گیا تھا۔'' اُس نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔ بال بال بچا تھا وہ بھی۔

کچھ دیر خود کو پرسکون کرنے کے بعد اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا، پھر تیار ہونے چل دیا۔ اُسے آج اسکول میں اہم کام نمٹانے تھے۔ پھر واپس پناہ گاہ آکر بچوں کو ہر شے کے حوالے سے تیار کر کے، انہیں ذمّے داریاں سونپنی تھیں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور اُسکے پیچھے پُرسکون رہیں۔

واپس آکر اسے اپنا سامان بھی باندھنا تھا۔

--------+---------+----------

علی نے گاڑی سے اتر کر نشمیہ کو اتارا۔ پھر اسے اسکول کا بستہ پہنایا۔ اتنی دیر میں احمد خود ہی اتر چکا تھا۔ وہ اتنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے ویسے بھی کسی کی مدد نہیں لیتا تھا۔

''اللہ حافظ بابا!'' نشمیہ کو بھاگنے کی جلدی تھی، آج اُسکا ٹائیکونڈو کا پریڈ تھا۔ اُسے وہاں جلد سے جلد پہنچنا تھا۔

''رکو ذرا!'' علی نے جھک کر نشمیہ کو پیار کیا۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر وہ احمد کی جانب جھکے ہوئے ہی بڑھا تو وہ بے ساختہ ہی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ علی ساکت رہ گیا۔

''اللہ حافظ بابا!'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ علی نے اسکا داخلہ بھی اسی اسکول میں کروادیا تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ نشمیہ کے ساتھ ہی اسکول جارہا تھا۔

''اللہ حافظ! اپنا اور بہن کا خیال رکھنا۔'' اُس نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے اسکول کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ نشمیہ اچھلتی کودتی اندر جاتی دکھائی دے رہی تھی جبکہ وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدگی سے چلتا اندر جا چکا تھا۔

علی گہری سانس لیتے سیدھا ہوا، پھر پشت پر کھڑی اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر، دور ہوتے اپنے دونوں بچوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں عجیب بے چینی سی تھی۔

''تمہاری بیٹی پڑھنے میں بہترین ہے۔ ذہین بھی ہے، دماغ بھی آرٹسٹ کا ہے۔'' اِس آواز پر اُس نے چونک کر دیکھا۔ رضاالٰہی نجانے کب وہاں آیا تھا؟ اب اُسی کی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا، سامنے اسکول کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ جس سے اب بھی کئی بچے اندر داخل ہو رہے تھے۔ علی نے بھی چہرہ واپس موڑ لیا۔ فضا میں نمی بہت زیادہ تھی، گرمی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔

''جبکہ احمد پڑھائی میں صرف ایوریج سٹوڈنٹ (اوسط طالب علم) ہے۔ لیکن اسکی دیگر صلاحیتیں مجھے حیران کر دیتی ہیں۔ وہ فٹبال کا بہترین کھلاڑی ہے۔ کبھی کبھار اپنی ٹیم کی جانب سے گول کیپر بھی بنتا ہے، اور اسکی موجودگی میں آج تک مخالف ٹیم گول نہیں کر سکی۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال کا ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے سے بڑے لڑکوں کی ٹیم کا حصہ ہے۔'' رضا نے بتایا۔

''وہ نو سال کا ہو جائے گا اگلے ماہ۔'' علی نے تصحیح کی، جسے رضا نے نظر انداز کیا۔

''وہ اسکریبل کا بہترین کھلاڑی ہے، آتے ساتھ ہی، اسکول کا چیمپیئن بن چکا ہے پچھلے ماہ۔ ہم اس سال اُسے سالانہ آل پاکستان اسکریبل کمپیٹیشن میں بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ چیس (شطرنج) میں بھی اچھا ہے۔'' علی کے چہرے پر کرب کے سائے لہرا رہے تھے۔ آنکھوں میں گوگلز تھے، ورنہ رضا نمی ضرور دیکھ لیتا۔ جو باتیں اسے خود معلوم ہونی چاہیے تھیں۔ وہ اُسے رضا بتا رہا تھا۔ وہ کتنا انجان تھا اپنی اولاد سے؟ اور رضا فقط دو ماہ میں احمد کو اتنے اچھے سے جان گیا تھا۔

''کیا میں ایک برا باپ ہوں؟'' اُس نے اسمبلی کے لیے باغ میں جمع ہوتے بچوں کو دیکھتے آہستگی سے پوچھا۔

''بہت برے۔'' بڑی فرصت سے جواب دیا گیا تھا۔ پر اس بار علی نے برا نہیں مانا، بس اُداسی سے مسکرا دیا۔

''نشمیہ اور احمد کے مزاجوں میں بہت فرق ہے۔ وہ زور زبردستی سے اپنی بات منوانا جانتی ہے۔ جبکہ احمد خاموش ہو جاتا ہے۔'' علی نے گوگلز اُتارتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ رضا خاموشی سے اسکی بات سننے لگا۔

''میں کبھی اُسکے ساتھ اچھا وقت نہیں گزار سکا۔ یقیناً! غلطی میری بھی ہے۔ پر اب۔۔۔۔ جب میں چاہتا ہوں کہ اپنی غلطیاں سدھاروں، تو وہ مجھ سے ہاں یا نہ سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا۔ میں اُسے گلے لگانا چاہتا ہوں پر وہ میرے پاس نہیں آتا۔ کیا وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے؟''

اُس نے رضا کو دیکھتے پوچھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو رضا، اُسے اُسکی ساری کوتاہیاں یاد دلا کر بتاتا کہ تم اسی لائق ہو۔ پر فلحال اُسکے سامنے ایک بے بس باپ کھڑا تھا، جو خود کو بدلنا چاہتا تھا۔ وہ اُسے مایوس نہیں کر سکتا تھا۔

''بچے نفرت نہیں کرتے، کسی سے نہیں کرتے۔ ماں باپ سے تو بالکل نہیں۔ وہ نفرت کرنے کے لئے بنے ہی نہیں ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''پر وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔'' وہ مایوس ہوا۔

''تو تم کرتے رہا کرو۔ میں نے تمہیں بتایا کہ احمد کو کیا پسند ہے؟ کیوں؟ تاکہ تم اُسکے لیے وہی سب کرو۔ تم نشمیہ کے لیے بھی تو کرتے ہو، اُسکے لیے وہ سب کرتے ہو جو وہ کہتی ہے۔ ایک دن اپنی کلاس ٹیچر کو خوش ہو کر بتا رہی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کو مہندی لگائی ہے۔''

اِس بات پر علی سامنے دیکھتا ہنسا۔

''تم احمد کے لیے بھی یہی سب کرو۔ اُسکے ساتھ فٹبال کھیلو، اُسکے ساتھ اسکریبل کا میچ رکھو۔ بچے صرف محبت اور توجہ کے بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ جلدی مان جاتے ہیں۔ احمد بھی مان جائے گا۔''

''یہ سب کرنے کے لئے اب وقت نہیں رہا۔ کل ہمیں نکلنا ہے۔'' اُس نے ایک بار پھر مایوسی سے کہا۔

''واپس آکر کر لینا۔ بہت وقت ہے ابھی!'' رضا نے تسلی دی۔

''اگر ہم زندہ واپس آئے تو۔۔۔۔'' اُس نے کہا تو رضا نے اُسے دیکھا۔

''تمہارا پتہ نہیں، پر میں تو زندہ واپس آنا چاہتا ہوں۔'' اِس بات پر علی نے بھنویں اُچکا کر اپنے برابر کھڑے رضا کو دیکھا۔

''تم تو خودکشی کرنے نہیں گئے تھے؟'' اُس کی زبان کبھی بھی نہیں رکنے والی تھی۔

''میں کچھ دیر اکیلے رہنا چاہتا تھا بس! پتہ نہیں کس گدھے نے تم لوگوں کو کہا کہ میں خودکشی کرنے گیا ہوں۔'' رضا نے خفگی سے جواب دیا۔

''ہاں واقع! گدھے ہی ہیں ہم! فضول میں اپنا وقت برباد کیا تھااُس روز۔''علی نے باز نہیں آنا تھا۔

''چلو تم نے یہ تو تسلیم کیا کہ تم گدھے ہو۔''وہ بھی بڑے سکون سے اُسے آگ لگاتا، کندھے اُچکاتا وہاں سے چلا گیا۔

''احمق!''پیچھے کھڑا علی دانت کچکچا کر رہ گیا۔

----------+---------+--------

کھڑکیوں کے پردے برابر تھے۔لیکن سورج کی روشنی ہلکی ہلکی اندر آنے کا راستہ بنا چکی تھی۔نیم اندھیرے کمرے کی کرسی پر عمر خاموش ساٹیک لگائے بیٹھا تھا۔چہرہ کمرے کی چھت کی جانب اور آنکھیں ویران تھیں۔وہ دو روز سے اسی طرح کمرے میں بند تھا۔امی آ کر اُسکے پاس بیٹھتیں، گھنٹوں روتی،اسکو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں، وہ انہیں یقین دلاتا رہتا کہ وہ اب ٹھیک ہے، مکمل صحت مند۔پر انکو تسلی نہ ہوتی۔ابّو اب تک نہیں آئے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے اُنہوں نے اسکی بات پر یقین نہیں کیا۔حالانکہ وہ اپنی ایک ایک رپورٹ، پوری میڈیکل ہسٹری ثبوت کے طور پر دے چکا تھا۔پر انکی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا۔دو روز سے وہ آفس بھی نہیں گیا تھا۔دروازہ کھلنے کی آواز آئی پر اُس کے وجود میں جنبش بھی نہ ہوئی۔خیال تھا کہ امی ہی ہوں گی۔پر کسی نے آ کر سر پر ہاتھ رکھا۔یہ امی کا ہاتھ نہیں تھا۔اُس نے چونک کر دیکھا تو حفیظ صاحب کھڑے تھے۔چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''ابّو!''وہ گھبرا کر سیدھا ہوا۔

''تم بتا بھی تو سکتے تھے۔کیا ضروری تھا کہ خود کو اور ہم کو اتنی اذیت دیتے؟''اُنہوں نے پوچھا تو اسکی آنکھیں بھر آئیں۔

''معاف کر دیں ابّو! غلطی کر دی میں نے بہت بڑی۔''اُنہوں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ماں باپ تو معاف کر دیتے ہیں۔اُنہوں نے بھی کر دیا۔

جب رو رو کر دل کچھ ہلکا ہو گیا تو عمر نے انہیں اپنے سامنے بٹھایا اور انکا ہاتھ تھاما۔

''ابّو! مجھے معاف کر دیں۔میں آپکا بیٹا واپس نہیں لا سکتا۔''وہ شرمندہ تھا۔

''میں نے غصّے میں کہا تھا بیٹا! خضر کی موت میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ اُس سے زیادہ شرمندہ تھے۔

''آپ روییے مت!'' اُس نے انکے آنسو صاف کیے۔

''عمر! تم عمارہ کو بتا دو۔ اُسکا بھی حق ہے سچ جاننا۔'' اُنہوں نے یکدم ہی کہا تو وہ ساکت ہوا۔

''تم بتا دو اُسے، کیا معلوم وہ واپس آ جائے۔ میں بھی اپنی پوتی کو دیکھ لوں گا۔'' عمر کو اب سمجھ آیا کہ اُنہوں نے یہ مطالبہ کیوں کیا؟ اُسکی طرح وہ بھی عمائمہ کو بہت یاد کرتے تھے۔

''ابّو!'' اُس نے پکارا۔ ''آپ مجھے ڈیڑھ ماہ کا وقت دیں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا۔ قسمت نے ایک مرتبہ پھر اُسے دس سال پیچھے لا کھڑا کیا تھا۔

''کیوں؟ ڈیڑھ مہینے بعد بتانا ہی ہے تو اب بتا دو۔'' اُسکے پاس جواب نہ تھا۔ کیا بتاتا؟ ایک قاتل سے چھپ رہا ہے؟ ایک انجان قاتل سے؟ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ بچ بھی سکے گا یا نہیں؟ اُسکے ماں باپ ایک بیٹا کھونے کے بعد کیا یہ صدمہ برداشت کر سکیں گے؟

آج ایک بار پھر وہ سچ بتانے اور نہ بتانے کے درمیان پھنس گیا تھا۔۔۔

آج ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جا رہی تھی۔۔۔۔

''ابّو! میں ایک کام کے سلسلے میں شہر سے دور جا رہا ہوں۔ ایک ایسی جگہ جہاں سے رابطہ بھی نہیں ہو سکے گا، سگنلز کے ایشوز ہیں وہاں۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا تو وہ بھونچکا رہ گئے۔

''تم۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔ جھوٹ بول رہے ہو نہ تم؟ پھر کچھ چھپا رہے ہو؟ پھر غلط بیانی کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے عمر؟'' وہ تقریباً چیخ اٹھے تھے۔ اُنکے اس شدید ردعمل پر وہ حیران رہ گیا۔

''مجھے سچ بتاؤ عمر! سچ بتاؤ!''

''ابّو! میں اور علی کام کے سلسلے میں پہلے بھی شہر سے باہر گئے ہیں۔اِس بار ہم ایک حساس ادارے کے آفس کے لیے انٹیر یئر کرنے جا رہے ہیں۔ جگہ اور ادارہ کیونکہ حساس ہے، تو اِس لیے ہمیں اجازت نہیں ہے موبائل استعمال کرنے کی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ علی میرے ساتھ ہی ہو گا۔''اُسے نہیں معلوم اِس جھوٹ پر اُنہوں نے کتنا یقین کیا؟ پر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا تو اسکے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''ہاں!''اُس نے بمشکل کہا۔

''کب جانا ہے؟''

''کل شام تک نکل جاؤں گا۔''اِس جواب پر اُنہوں نے بس اثبات میں سر ہلایا۔

اسکے بعد وہ جتنی دیر وہاں رہے، یا تو اچانک سے رونے لگتے یا پھر پریشان ہونے لگتے۔ عمر اُنکی ہر کیفیت کو تحمل سے دیکھتا رہا۔ پھر جب اُنہیں کچھ تسلی ہوئی تو اُسکے ماتھے پر بوسہ دیتے وہ وہاں سے چلے گئے۔

عمر کو نہیں سمجھ آرہا تھا کہ ماں باپ سے معافی ملنے کے بعد اُسے خوش ہونا چاہیے؟ یا ایک بار پھر انہیں دھوکا دینے پر شرمندہ ہونا چاہیے؟ ضمیر الگ کچوکے لگا رہا تھا۔ مگر دل انہیں سچ بتانے پر بھی تیار نہ تھا۔

زندگی نے اُسے عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

----------+---------+--------

''سامان تیار رکھنا اپنا، کل صبح تم این جی او خود چلی جانا، واپسی پر میں پک کر لوں گا۔ تمہیں وہاں سے ڈائریکٹ امی کی طرف ہی چھوڑ دوں گا۔''رات کے کھانے کی میز پر نوید نے بشریٰ سے کہا تھا۔

''تم پہلے بھی اتنے آپریشنز پر گئے ہو۔ میں ہمیشہ اکیلے رہی ہوں، یہاں تک کہ۔۔۔۔''وہ رکی۔ نوید پوری توجہ سے اُسکی بات سننے لگا۔

''یہاں تک کہ؟''اُس نے کھانے کا چمچ ٹیبل پر رکھا، دونوں بازو باہم ملائے، میز پر ٹکا کر اُسے دیکھا۔

''یہاں تک کہ جب میں ذہنی طور پر صحت یاب نہیں تھی، تب بھی میں تمہارے پیچھے اکیلے رہتی تھی۔اب کیا ہو گیا جو تم مجھے مامی کے گھر چھوڑنا چاہتے ہو؟'' اُسے اِس احتیاط کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''کیونکہ پچھلے چار سالوں سے میں کسی بھی ایسے آپریشن پر نہیں گیا، جو تین دن سے زیادہ پر محیط رہا ہو۔اب مجھے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے لیے جانا ہے۔تو میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی پریشانی ہو۔'' اُس نے وضاحت دی۔سامنے بیٹھی عورت اور ایک وحید بھائی کے علاوہ وہ کسی کو وضاحت نہیں دیتا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ مجھے وہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی؟'' اُس نے طنز نہیں کیا تھا۔سادہ سے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔تم بھی میرا یقین کرو۔'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''ٹھیک ہے! تم کہہ رہے ہو تو یقیناً بہتر سمجھتے ہو گے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مطمئن ہوا۔پھر وہ کافی دیر اُس سے یہاں وہاں کی باتیں کرتی رہی۔کچھ کام کے حوالے سے، کچھ گھر کے حوالے سے۔نوید خاموشی سے، پر پوری توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔یہاں تک وہ اپنے اور اُسکے لیے چائے بنا کر لے آیا، تب بھی وہ مسلسل کچھ نہ کچھ بولتی رہی تھی۔وہ مُسکراتے ہوئے اُسکے ساتھ بیٹھ گیا۔

''تم مجھے یاد کرو گے؟'' اُس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے اچانک ہی پوچھا تو نوید نے مسکراتی آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے دیکھا، پھر بولا۔

''نہیں!'' ''بد تمیز نہ ہو تو۔

''میں بھی نہیں کروں گی۔اتنے کام ہوتے ہیں۔بھلا یاد کرنے کا وقت کس کے پاس ہو گا؟'' وہ بھی نروٹھے انداز میں بولی تو وہ ہنسا۔

''میں بھلا کیسے یاد کروں گا تمہیں؟ تم تو ہر وقت میرے ساتھ ہو گی۔'' اِس بات پر اُس نے حیران نظروں سے نوید کو دیکھا۔

''یہاں ہو گی۔'' پہلے دل پر شہادت کی انگلی رکھی، پھر وہی انگلی دماغ کے مقام پر رکھی۔''اور یہاں بھی۔تو پھر یاد کیسے کروں؟'' دل و دماغ میں اُسکا مقام بتا کر اب وہ چائے پیتے، آنکھوں میں شرارت لیے، منہ کھولے خود کو تکتی بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ ڈائیلاگ کہاں سے سیکھے ایس ایس پی صاحب نے؟'' اُس نے ذرا مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''ایس ایس پی صاحب کیا انسان نہیں ہیں؟'' اُس نے مصنوئی خفگی سے پوچھا۔

''تھوڑے تھوڑے سے ہیں۔''اِس بات پر دونوں ہنس دیئے۔

----------+---------+--------

''تمہاری کوئی بات میرے سمجھ نہیں آسکی ہے۔ کل سے لیکر میں نے اب تک خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔''وہ مکرم کو ڈیڑھ ماہ کے لیے مقدّس کے پاس چھوڑ کر جا رہا تھا۔ لہٰذا آج مکمل طور پر اُسکا سامان اور خود اُسے بھی اُسکی خالہ کے حوالے کرنے آیا تھا۔

''تو پھر کیا تم نے یقین کیا؟''لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے مقدّم نے سوال کیا۔

''کر لیا! گو کہ میرا دماغ یہ بات نہیں مان رہا کہ اِس دور میں کسی شخص کو کام کے لیے بلایا جائے اور اُسے کچھ لمحوں کے لیے بھی اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنے کی اجازت نہ ہو۔ لیکن تم کہہ رہے ہو تو میں نے مان لیا ہے۔''اپنی گود میں بیٹھے مکرم کے ہاتھوں سے کھیلتی مقدّس نے جواب دیا۔

''حساس ادارے ایسے ہی کام کرتے ہیں۔''اُس نے وہی جھوٹ دہرایا۔''تم پریشان نہ ہو، میں جلد واپس آؤنگا۔ تب تک تم آرام سے شادی کی تیاریاں کرو۔''اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ بس خاموش رہی۔

''اچھا ایک بات تو بتاؤ۔''وہ سیدھا ہوتے اچانک بولا۔

''کیا؟''

''تم نے مجھے بالکل اچانک کیسے پروپوز کر دیا؟ یعنی۔۔۔ مجھے تو یہ لگتا تھا کہ شاید میرا امیج تمہاری نظروں میں کافی خراب ہو گا۔''اُس نے اُسکا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا تھا؟''اُس نے پوچھا۔

''کیونکہ میں نے جان کر نہیں! پر ہمیشہ تمہیں سیکنڈ priority(دوسرا درجہ) دی ہے۔ تمہیں یقیناً برا تو لگتا ہو گا؟''اُس نے جانچنا چاہا۔

"مقدّم!" وہ گہری سانس لیکر سیدھی ہوئی۔ "میں خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتی۔ نہ میں اُن لڑکیوں میں سے ہوں جنہیں ہر وقت پرنسز ٹریٹمینٹ (شہزادیوں جیسی دیکھ بھال) چاہیے ہوتی ہے۔ دنیا بہت مشکل ہے، سب کی زندگی میں ہزاروں کام ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی شخص چوبیس گھنٹے آپکے لیے دستیاب نہیں رہ سکتا۔ ہمیں دوسروں کو سمجھنا چاہیے، انکو اسپیس دینی چاہیے۔ ہر وقت کسی کے سر پر سوار رہنے سے آپکی اپنی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں! مجھے کچھ وقت کے لیے تمہارا، مجھے دوسرے درجے پر رکھنا برا لگا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں کب سے ایسا سوچنے لگی ہوں؟ تم بے شک! دیر سے آتے تھے، پر آجاتے تھے۔ تم میری کہی کسی بات کو بھولتے بھی نہیں تھے، بھول جاتے تو معذرت بھی کر لیتے تھے۔ آدمی معذرت اُسی سے کرتا ہے، جو اُسکے لیے اہم ہو۔ اور ویسے بھی، میرا ماننا ہے کہ اگر کسی شخص میں کوئی ایک برائی ہو، پر سو اچھائیاں بھی موجود ہوں، تو ہمیں اُسکی ایک برائی کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ تم شاید کبھی نہ کہہ سکو، میں کیوں وقت ضائع کروں؟ تم سوچنے میں وقت لیتے ہو، میں تو نہیں! میں زیادہ سوچنے میں موقع نہیں گنواتی۔ لٰہذا! میں نے یہ موقع بھی نہیں گنوایا۔" اُس نے مدلل انداز میں اپنی بات مکمل کی۔ جبکہ وہ حیرت کا بت بنے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ وہ اتنی سنجیدہ گفتگو بھی کر سکتی ہے۔

"اگر میں انکار کر دیتا تو؟" اُس نے مذاق کی غرض سے پوچھا۔

"تو کیا؟ تمہارے پاس انکار کا حق محفوظ ہے۔ میں تمہارے فیصلے کا احترام کرتی۔" آج وہ اُسے حیران کر رہی تھی۔

"میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسی سوچ رکھنے والی لڑکی ملی ہے۔" اُس نے دل سے کہا تو وہ مسکرائی۔

"مجھے اب جانا چاہیے۔" مقدّم نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"میرا انتظار کرنا۔" مقدّم نے کہا۔

"ہمیشہ کروں گی۔" اُس نے کہا تو وہ مسکرایا اور جانے کے لئے پلٹ گیا۔ وہ پلٹا تو ساری مُسکراہٹ سمٹ گئی۔

ایک بار ایسے ہی لیلیٰ بھی جا رہی تھی۔۔۔

ایک بار ایسے ہی اُس نے کہا تھا کہ واپس آؤ گی تو ہم شادی کریں گے۔۔۔۔

ایک بار ایسے ہی وہ بھی لیلیٰ کا انتظار کرنے کو تیار تھا۔۔۔

اور آج۔۔۔

زندگی پھر اُسی موڑ پر لا رہی تھی۔۔۔

آج کیا پھر کہانی خود کو دہرانے لگی تھی؟

----------+---------+--------

''تو آج ہم نے کیا سیکھا؟'' کتاب بند کر کے علی نے نشمیہ سے پوچھا۔

''کیا سیکھا؟'' اُس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

''کہ ہمیں وقت پر سونا چاہیے، اور بڑوں کی ہر بات ماننی چاہیے۔'' علی نے اپنے برابر میں لیٹی نشمیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے سونے سے پہلے کہانی سنا رہا تھا۔

''یہ تو مجھے پہلے سے معلوم تھا۔'' اُس نے بتایا۔

''تم اب چپ کر کے سو جاؤ۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔'' علی نے اُسکا بک بک کرنے کا موڈ دیکھتے ہوئے، فوراً کمبل اُسکے منہ تک ڈالتے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

''میں دس تک گنتی کر رہا ہوں۔ مجھے تم سوتی ہوئی نظر آنی چاہیے ہو۔'' علی نے کہا اور کمرے کی بالکنی کے پاس آ گیا۔

''میں دس سیکنڈ میں آ کر دیکھوں گا۔'' نشمیہ کو یاد دھانی کرواتے وہ بالکنی میں آیا۔ کل کے لیے سامان وہ باندھ چکا تھا۔ دل عجیب اُداس سا تھا۔ بچوں کو چھوڑ کر ایک انجان سفر اور ایک انجان منزل کی طرف جانا بہت مشکل تھا۔ بالکنی میں کھڑا وہ، جیبوں میں ہاتھ ڈالے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ستارے خوب چمک رہے تھے۔ آسمانوں سے ہوتے اُسکی نظریں گھر کے لان تک گئیں۔ ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑوں میں وہ فاطمہ ہی تھی۔ سینے پر بازو باندھے، نظریں فرش پر ٹکائے وہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ علی نے کچھ سوچ کر پیچھے سوئی نشمیہ کو دیکھا۔ وہ

واقعی سو چکی تھی۔ پھر بالکنی کا دروازہ بند کر کے وہ بھی کمرے سے باہر آ گیا۔ سفیر صاحب احمد کو لیکر بازار گئے ہوئے تھے۔ اُسے فٹبال کے حوالے سے کچھ چیزیں خریدنی تھی۔ علی کو بھی ساتھ چلنے کو کہا پر اُس نے منع کر دیا کہ اُسکی موجودگی میں احمد بلاوجہ ہچکچاتا رہے گا۔

وہ آہستہ قدم اٹھاتے لان میں آ گیا، قدموں کی آواز پر فاطمہ رکی، نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

وہ رک گیا۔۔۔ تھم گیا۔۔۔ ٹھہر گیا۔۔۔

مستقل علاج سے اُسکی صحت دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ بھرنے لگا تھا، آنکھوں کے نیچے سے حلقے تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ جلد پر ایک شادابی سی آ گئی تھی۔ وہ سادگی میں بھی غضب ڈھانے لگی تھی۔

وہ علی کو دیکھ رہی تھی۔۔۔

اور علی اُسے۔۔۔

درمیان میں فاصلہ آٹھ دس قدموں کا تھا۔ یا شاید آٹھ دس سالوں کا!

وہ دونوں رک گئے تو وقت بھی رک گیا۔ ہوائیں بھی رک گئیں اور سانسیں بھی۔۔۔

پھر وقت چلا۔۔۔

چلا اور دونوں کو دس سال پیچھے لے گیا۔۔۔

اسی گھر کا لان تھا۔ ایسے ہی فاطمہ لان میں چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ علی آفس کے کاموں میں مصروف ہوتا تو وہ یہاں وقت گزارتی پھر وہ کام مکمل کر کے یہیں آ جاتا۔ پھر اُسے دیکھ کر پوچھتا۔

"میرا انتظار کر رہی تھی؟" وہ آج بھی سامنے کھڑا تھا۔ وہ خاموش تھا تو یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ کیا ماضی آس پاس کہیں گونج رہا تھا؟ یا اُنکے دل و دماغ میں؟

"نہیں! میں تو صرف میٹھے پان کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ نخرہ دکھاتے کہتی۔ وہ آج بھی سامنے تھی، خاموش تھی۔ تو پھر اُسکے جملے کانوں میں کیسے گونج رہے تھے؟

''میں ہمیشہ تمہیں انتظار کرواتا ہوں۔'' علی کو احساس ہوتا تو کہتا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ سنجیدہ ہو گیا تھا۔۔۔ سمجھدار ہو گیا تھا۔۔۔ بردبار ہو گیا تھا۔۔۔۔

''گول گپوں اور میٹھے پان کے لیے اتنا انتظار کر سکتی ہوں۔'' وہ اُسے چڑاتی۔ وہ بھی سامنے کھڑی تھی۔ پانچ سالوں میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ خود مختار ہو گئی تھی۔۔۔ خوددار ہو گئی تھی۔۔۔ باوقار ہو گئی تھی۔۔۔۔

اُن دونوں میں فاصلے کہاں سے آئے تھے؟ مسائل اتنے کیسے ہو گئے تھے؟ غلطی کس کی تھی؟ خود غرض کون ہوا تھا؟ علی یا فاطمہ؟ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ علی قدم بڑھا کر قریب آیا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

''میں نے لان میں صبح اسپرے کروایا ہے۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔'' وہ فکر مند ہوا۔

''میں اندر چلی جاتی ہوں۔'' اُس نے سر جھکاتے ہوئے سعادت مندی سے کہا اور اُسکے برابر سے ہوتی آگے بڑھ گئی۔ علی بھی اُسکے پیچھے خاموشی سے اندر آیا۔ فاطمہ کے قدم سیڑھیوں کی جانب تھے، علی رکا۔

''فاطمہ!'' اُس نے آواز دی تو وہ رکی۔ پھر پلٹی اور اُسے دیکھا۔

''تم سے بات کرنی ہے۔'' اُس نے آہستہ آواز میں کہا تو وہ سر ہلاتی وہیں آ کھڑی ہوئی جہاں علی تھا۔ مگر تھوڑا فاصلے پر۔

''میں نے تمہیں سچ بتا دیا تھا، ابّا کو بھی سچ بتا دیا ہے کل۔'' اُس نے ابّا کو کل رات ایک ایک بات سچ سچ بتا دی تھی۔ کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوئے تھے۔ علی نے اُنہیں مضبوط رہنے کو کہا تھا اور ساتھ تاکید کی تھی کہ بچوں کا خیال رکھیں۔

''ہمم!'' اُس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''میں بچوں کو اللہ کے بعد تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔'' اُس نے کہا تو فاطمہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ کیا وہ اُس پر بھروسہ کر رہا تھا؟

''کیا۔۔۔کیاتم نے۔۔۔تم نے مجھے معاف کر دیا؟''اُس نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

''میں انسان ہوں فاطمہ! مجھے ناخدامت بناؤ۔ بار بار معافی نہ مانگو مجھ سے۔''علی کے لہجے میں دکھ تھا۔اُس نے انکار کیا تھا نہ اقرار۔

''میں خود غرض ہوں علی! اب بھی چاہتی ہوں کہ آخرت میں سزا نہ ملے۔اِس لیے بار بار تم سے معافی مانگتی ہوں۔''اُس نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ نمی دونوں طرف تھی۔ علی نے نظریں چرا لیں۔

''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں ایک بار پھر تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔اِس اُمید پر کہ۔۔۔کہ اِس بار تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔ میرے پیچھے میرے بچوں کا خیال رکھو گی۔''اُس نے سر جھکائے ہی کہا تو پہلی بار فاطمہ مسکرائی۔

''میں تمہارا بھروسہ نہیں توڑوں گی۔''علی نے اسکی آواز سنی تو فرش پر نگاہیں ٹکائے ہی سر ہلا دیا۔وہ دوبارہ اُسکی آنکھوں میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ علی نے چہرہ اُٹھا کر اُسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔اُسکی نگاہوں نے آخر تک اُسکا پیچھا کیا تھا۔

پورچ میں گاڑی کی آواز آرہی تھی۔ شاید سفیر صاحب آ گئے تھے۔وہ بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ نشمیہ دنیاومافیہا سے بے خبر سوئی ہوئی تھی۔اُسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا؟

اللہ معاف کر سکتا ہے، تو بندہ کیوں نہیں؟

----------+---------+--------

مورخہ تین مئی:

دو روز سے وہ آفس نہیں گیا تھا۔ بیچارہ علی ہی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔لہٰذا آج وہ ہر صورت آفس جانا چاہتا تھا۔ تیزی سے ناشتہ کر کے وہ گھر کے گیراج میں آیا اور گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھول کر اپنا لیپ ٹاپ اندر رکھا، پھر دروازہ بند کر کے مڑا تو پیچھے کھڑے حفیظ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔وہ نجانے کب وہاں آئے تھے؟

''ابّو! طبیعت ٹھیک ہے آپکی؟''عمر نے انہیں خود کو خاموش نظروں سے تکتا پا کر پوچھا۔

''اپنا موبائل دینا۔''انہوں نے کہا تو عمر حیران ہوا۔

''کیوں؟''

''اب سوال کرو گے مجھ سے؟''وہ ناراض ہوئے۔

''نہیں! ہر گز نہیں! آپ لے سکتے ہیں۔''اُس نے موبائل اُنکے حوالے کیا۔اُنہوں نے اُسکا موبائل جیب میں ڈالا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''ابّو! آپ اندر کیوں بیٹھ گئے؟ کوئی مسئلہ ہوا ہے؟ کہیں جانا ہے آپکو؟''اُس نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر پریشانی سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ تمہارے آفس جاؤں گا۔''اُنہوں نے سکون سے کہا۔

''میرے آفس؟''وہ مزید حیران ہوا۔

''ہاں! میں تمہارے دوست علی سے ملنا چاہتا ہوں۔میں بھی دیکھوں کہ تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟''عمر کا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''پر ابّو میں نے آپکو کل بتایا تو تھا۔''وہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر اُنہیں ہو کیا گیا تھا؟

''میں علی سے سننا چاہتا ہوں۔''اُنکے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔

''آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟''اُس نے افسوس سے کہا۔

''نہیں!''انہوں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا تو وہ خاموش رہ گیا۔

''جلدی بیٹھو گاڑی میں، دیر ہو رہی ہے۔''انہوں نے اُسے سر جھکائے کھڑا دیکھ کر کہا تو وہ چپ چاپ گاڑی میں آ بیٹھا۔پھر اُس نے گاڑی سٹارٹ کی اور آفس کے راستے پر ڈال دی۔وہ ٹھیک ٹھاک پریشان تھا۔ابّو نے اُسے موقع ہی نہیں دیا تھا، ورنہ وہ علی سے رابطہ کر کے اُسے صورتحال سے آگاہ کر دیتا۔پتہ نہیں علی انہیں کیا بتائے گا؟ سوچ سوچ کر اُسکا دل بیٹھ رہا تھا۔

''ابّو! ٹھیک ہے آپ مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہے۔ پر میرا موبائل تو دے دیں۔'' راستے میں اُس نے کہا۔

''تاکہ تم اپنے دوست کو میرے آنے کی پیشگی اطلاع دے دو؟'' وہ بھی آخر اُسکے باپ تھے۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مجھ پر بھروسہ ہی نہیں کر رہے تو میں کیا کہوں؟ حالانکہ میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔'' آخر میں اُسکی اپنی آواز نے اُسکا ساتھ نہیں دیا۔

''اگر جھوٹ نہیں بولا تو پھر پریشان کیوں ہو؟'' اُنہوں نے کہا۔

''نہیں میں پریشان نہیں ہوں۔'' اُس نے لہجہ سنجیدہ رکھتے ہوئے کہا۔ آفس آ چکا تھا، جبکہ اُسکے ماتھے پر پسینے کے قطرے واضح تھے۔ وہ دونوں آفس کی عمارت میں داخل ہوئے اور لفٹ کے ذریعے اپنے مطلوبہ فلور پر پہنچے۔ پورے راستے عمر کو امید تھی کہ علی یہیں کہیں مل جائے تو وہ اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ ہی کر دے۔ پر وہ نظر نہ آیا۔ یا تو پہلے ہی آفس پہنچ چکا تھا یا آیا نہیں تھا اب تک۔

بلآخر جب وہ دونوں آفس میں داخل ہوئے تو ملازمین کے کیبنز کے آخر میں بنے کمرے میں، شیشے کے دروازے کے پار اپنی کرسی پر بیٹھا علی نظر آ گیا۔ وہ کام میں مصروف تھا۔ عمر نے تھوک نگلا۔

''کیا وہ ہے علی؟'' حفیظ صاحب نے اُسکی طرف اشارہ کر کے عمر سے پوچھا تو اُس نے بس اثبات میں سر ہلایا۔ وہ عمر سے بھی پہلے اُسکے آفس کے دروازے پر پہنچے اور دستک دی۔ وہ اُسکے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔

''آ جائیں!'' علی نے سر اٹھائے بنا ہی اجازت دی۔ عمر نے دانت کچکچا کر اُسے دیکھا۔ کیا تھا جو چہرہ اُٹھا لیتا؟ اجازت ملنے پر وہ اندر داخل ہوئے تو علی نے چہرہ اٹھایا، اور اگلے ہی لمحے اُسکی آنکھوں میں تحیر اُمڈ آیا۔

''انکل آپ؟'' وہ جلدی سے کھڑا ہوا اور احتراماً اپنی کرسی چھوڑ کر اُنکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اُس نے اُنکی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو بیٹا؟'' اُنہوں نے سنجیدگی سے جواب دیتے عمر کو دیکھا جو علی کو ہی اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ اُنکو خود کو دیکھتا پا کر سر جھکا گیا۔

''کیا کچھ ہوا ہے؟'' علی نے اُن دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''معاف کرنا بیٹا! تمہیں اسطرح تنگ کیا۔ پر میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اُنہوں نے کہا۔

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں انکل! آپ جب چاہیں آسکتے ہیں۔ بیٹھیں!'' اُس نے شرمندگی سے کہتے کرسی کی جانب اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے، عمر بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ جبکہ علی نے اپنی نشت سنبھالنے کی بجائے، سامنے صوفے پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ یہ بڑوں کا احترام تھا، حفیظ صاحب اُسکی تربیت سے بڑا متاثر ہوئے۔ وہ اِس طرح بیٹھے تھے کہ گاہے بگاہے عمر پر بھی نظر ڈال لیتے۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ عمر نے مجھے بتایا کہ وہ ڈیڑھ ماہ کے لیے کہیں جا رہا ہے۔ اب میں تم سے جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کہاں جا رہا ہے؟'' اُنہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں پوچھا تو علی نے عمر کی جانب دیکھا، جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''اُسکی طرف نہ دیکھو! مجھے بتاؤ جو تم جانتے ہو۔'' اُنکے لہجے میں ایک رعب تھا۔

''انکل! یہ اکیلا نہیں جا رہا ہم دونوں ہی جا رہے ہیں۔ ایک کلائنٹ ہیں، جنکے لیے ہمیں انٹیریر کرنا ہے۔ کام زیادہ ہے اِس لیے وقت بھی زیادہ لگے گا۔'' اُس نے آہستگی سے کہا تو عمر نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تو یہ کیسا کام ہے کہ تم لوگ ہم سے رابطہ نہیں کر سکتے؟'' انکا لہجہ تفتیشی تھا۔ عمر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''ہم حساس ادارے کے لیے کام کرنے جا رہے ہیں۔'' ویسے تو یہ جھوٹ بہت ہی بودا تھا۔ کیونکہ جس انسان کو حساس ادارے کے بارے میں ذرا بھی معلومات ہوں، وہ باآسانی جان سکتا ہے کہ ایسے ادارے یوں ہی کسی کو بھی کام کے لیے دعوت نہیں دے دیتے۔ پر فلوقت یہی جھوٹ مناسب لگا۔ عمر نے دیکھا تھا کہ علی کا جواب سن کر وہ کچھ مطمئن ہوئے ہیں۔

''کیا آپکو عمر نے نہیں بتایا تھا؟'' علی نے پوچھا۔

''بتایا تھا! پر مجھے بھروسہ نہیں تھا۔'' اُنہوں نے بنا کسی لگی لپٹی کے کہا۔

''اچھا؟ وہ کیوں؟'' وہ مسکرایا اور عمر کی جانب دیکھا جسکا چہرہ اب بھی جھکا ہوا تھا۔

"کیونکہ اِس نے پہلے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔اِس نے ہمیں کہا تھا کہ یہ کیریئر بنانے بیرونِ ملک جارہا ہے۔ حلانکہ یہ وہاں اپنی موت سے لڑنے گیا تھا۔ ہم سب سے جھوٹ بول کر۔"اِس بات پر جہاں عمر نے جھٹکے سے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا تھا وہیں علی کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔

"کک۔۔۔کیا مطلب؟"اُس نے بے یقینی سے دیکھا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم؟اسے ٹیومر ہو گیا تھا۔اور اِسکا علاج تقریباً ناممکن تھا،اگر سرجری ہو جاتی تو زندہ رہنے کی امید کم تھی۔یہ ہم سے جھوٹ بول کر اور اپنی بیماری چھپا کر یہاں سے چلا گیا تھا۔اِس نے سرجری کروائی،اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا،چار سال کومہ میں رہا۔اور ہم سب یہاں اِس سے نفرت کرتے رہے کہ شاید یہ خود غرض ہو گیا ہے۔مجھے لگا شاید یہ ایک بار پھر یہی کر رہا ہے۔اِس لیے تم سے تصدیق چاہی۔"وہ رو دیئے تھے۔عمر کی آنکھیں بھی نم ہوئی تھیں۔جبکہ علی۔۔۔علی کو لگا کہ آفس کی چھت اُسکے سر پر آ گری ہو۔

وہ آخری پیشی سے پہلے ہونے والی ملاقات۔۔۔

وہ آخری ملاقات۔۔۔

وہ آخری جھگڑا۔۔۔

سب نظروں کے سامنے گھوم گیا۔اُس نے جانے سے پہلے علی سے کہا تھا کہ کہاسنا معاف کرنا۔وہ اُس کو گلے لگانے آگے بڑھا تھا،پر علی نے اُس سے گلے ملنا تک گوارہ نہ کیا تھا۔اپنے اندھے جنون میں اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اُسکے دوست کو اچانک سے کیا ہو گیا ہے؟اُس نے اُس سے پوچھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔زندگی نے جیسے قسم کھائی تھی کہ وہ روزانہ علی سفیر کو آئینہ دکھائے گی۔اور وہ روزانہ زمین میں گڑے گا۔وہ کتنوں کا دل دکھانے کا سبب بنا تھا؟

اُسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ مسلسل عمر کو دیکھ رہا ہو،ع،جسکا چہرہ جھکا ہوا تھا۔جبکہ حفیظ صاحب اُسے مزید بھی کچھ بتا رہے تھے۔

"نہیں انکل!اِس بار یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔"علی نے خود کو کہتے سنا۔حالانکہ اِس بار بھی وہ جھوٹ ہی بول رہا تھا۔پر ایک باپ کو وہ مزید تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔

''میں کیا کروں بیٹا؟ میں اپنا ایک بیٹا کھو چکا ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔'' یہ ایک اور انکشاف تھا۔ یااللہ! وہ کیا کچھ سہہ چکا تھا؟اور علی یہ سمجھتا رہا کہ وہ اُسے بیچ راہ میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بیچ راہ میں تو علی نے اُسے چھوڑا تھا۔ وہ جا رہا تھا تو علی نے اُسے جانے دیا تھا؟ اُسے روکا نہیں، اُس سے پوچھا نہیں۔۔۔ نہیں پوچھا کہ کیا ہوا تھا اُسے؟

''انکل!'' علی نے اُنکا ہاتھ تھاما۔

''عمر میرا بھائی ہے۔'' عمر جو کب سے نم آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔اِس جملے پر اُسکی سانسیں رکی۔ سماعتیں بے یقین ہوئیں۔

''اِسکی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ یہ جیسے جا رہا ہے، میرا وعدہ ہے کہ میں اِسے اپنے ساتھ ویسے ہی واپس لیکر آؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' اُس نے اُنہیں یقین دلاتے ہوئے کہا تو انہیں یقین آ گیا۔

''تمہارا شکریہ بیٹا! اللہ تمہیں خوش رکھے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ جبکہ عمر کی سماعتیں تو لفظ **میرا بھائی** پر ہی رک گئی تھیں۔

''آپ کس طرح جائیں گے؟ کیا میں ڈرائیور سے کہہ کر آپکو ڈراپ کروا دوں؟'' علی اب اُن کو کھڑا ہوتا دیکھ پوچھ رہا تھا۔

''شکریہ بیٹا! پر میرا ڈرائیور آ چکا ہے۔ میں اُسے یہاں آنے کا کہہ کر آیا تھا۔'' انہوں نے کہا۔

''میں آپکو پارکنگ تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' اتنی دیر میں عمر پہلی دفعہ بولا۔

''نہیں تم بیٹھو! میں چلا جاؤں گا۔'' اُنہوں نے اشارے سے منع کرتے ہوئے اُسکا موبائل اُسے واپس کیا۔ پھر علی نے اُٹھ کر اُن سے مصافحہ کیا اور وہ چلے گئے۔ اُنکے جانے کے بعد کمرے میں بس وہ دونوں رہ گئے، عمر کھڑا ہوا اور اُسے دیکھا۔ آنکھیں نم تھیں۔

''میں تمہیں کبھی چھوڑ کر نہ جاتا، اگر۔۔۔'' عمر کہتے کہتے رکا۔ علی نے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ دیا، آگے بڑھا اور اُسکے گلے لگ گیا۔ عمر کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر نکلا، اور اُسکے کندھے میں جذب ہو گیا۔

''تم لوگوں نے میری دوستی کا صحیح امتحان لیا ہے۔ نہ نوید نے اپنے خدشے بتائے، نہ مقدّم نے جانے سے پہلے اطلاع دی، نہ رضا نے کچھ کہا اور نہ تم نے۔'' عمر نے اپنے کانوں میں اُسکی آواز سنی۔

''آئی ایم سوری!'' اُس نے بس اتنا ہی کہا تو علی اس سے الگ ہوا اور ناراضگی سے اُسے دیکھا۔

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ چاہئے زبردستی ہی کیوں نہ پوچھتا۔ پر میں اپنے جنون میں اندھا ہو گیا تھا۔'' علی نے اُسے کندھوں سے تھام کر، زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے اعتراف کیا۔ دل میں گڑی آخری پھانس بھی آج نکل گئی۔ اُسکے دوستوں نے اُسے چھوڑا نہیں تھا، وہ سب اپنی اپنی جنگ لڑنے کے لیے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

''مجھے بتانا چاہیے تھا۔ پر شاید میں اتنا سمجھدار نہیں تھا۔'' اُس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ''پر میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا۔'' پھر اسکو دیکھ کر کہا۔

''اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس ایک دن کو زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیتا، کوئی اسے کبھی یاد نہ کرتا۔ بھول جاؤ اُس بات کو، سب سے زیادہ قصور میرا تھا۔'' علی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر آج ختم کرتے ہیں اس بات کو۔'' بلآخر صلح کے لیے پہلی کوشش ہو گئی۔

''بالکل! پر تم مجھے پہلے یہ بتاؤ ہے کہ تمہیں کیا ہوا تھا؟'' اُس نے پوچھا تو عمر اثبات میں سر ہلاتے بیٹھ گیا۔ پھر وہ ہر شے اسے بتاتا چلا گیا۔ اُسے سن کر علی کو مزید شرمندگی نے آگھیرا۔ جتنے عرصے وہ اسے دھوکے باز اور بے مروت دوست سمجھ کر یاد کرتا رہا، اتنے عرصے وہ زندگی، موت اور رشتوں کی جنگ لڑتا رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں ایک بار پھر اُن سے جھوٹ بول رہا ہوں۔'' بات مکمل کر کے اُس نے آہستہ سے کہا۔

''بعض چیزیں وقت کی ضرورت ہوتی ہیں۔ اس وقت تم اُنہیں سچ بتاؤ گے تو وہ ختم ہو جائیں گے۔ اور تمہارا جانا بھی مشکل ہو جائیگا جو کہ اس وقت بہت ضروری ہے۔ تم اس بار مرنے نہیں جارہے عمر! اپنی جان بچانے جارہے ہو۔'' اُسکے برابر بیٹھے علی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دینے والے لہجے میں کہا تو اُس نے سر ہلایا۔ پھر چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ میں نے بھی ابّو سے یہی جھوٹ بولا ہے۔'' اُس نے پوچھا۔

''کیونکہ آخری بار ایف آئی اے کے آفس میں حسین نے سب کو یہی جھوٹ بولنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے کیا کہا ہو گا؟ پر مجھے فوری طور پر یہی سمجھ آیا تھا۔'' وہ مُسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

''تمہارا شکریہ!'' عمر نے کہا۔

''شکریہ کس بات کا؟'' وہ انجان بنا۔

''جو بھی تم نے میرے لیے کیا، اُسکے لیے۔''

''اب تم نے دوست کہا ہے تو اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔'' علی نے کندھے اُچکاتے اُسے حیران کیا تھا۔ اُس نے علی کو دوست کہا تھا، تو اُس نے بھی تو اُسے بھائی کہا تھا۔

----------+---------+--------

''میں جلدی نہیں آسکوں گی۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ آج این جی او میں ایک غیر ملکی وفد آرہا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔'' ایف آئی اے کی بلڈنگ میں نوید عالم فون کان سے لگائے بشریٰ کی بات سن رہا تھا۔ سیاہ جینز پر سیاہ پولو ٹی شرٹ پہنے، وہ دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔

''اِس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟'' اُس نے نرمی سے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا نا کہ آج تم مجھے پک کرو گے، اور امی کی طرف چھوڑو گے۔ جب وفد واپس جائیگا، تب تک تو تمہاری میٹنگ شروع ہو جائے گی شاید!'' وہ اُداس ہوئی۔ وہ آخری بار نوید کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ اگر میٹنگ شروع ہو بھی گئی تو میں ڈرائیور بھیج دوں گا۔ نہیں بلکہ رکو!'' وہ یکدم بولا۔ ''وحید بھائی بھی آج ملنے آئیں گے، انہیں فرّخ صاحب سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ انہیں کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں اپنے ساتھ ہی لے آئیں۔ پھر میٹنگ کے بعد میں تمہیں امی طرف خود چھوڑ دوں گا۔'' اُس نے منصوبہ ترتیب دیا۔

''تمہارے آفس؟'' اُسکی پوری آنکھیں کھلی تھیں۔

''ہاں! میرے آفس!'' وہ پھر مسکرایا۔ ''تم آؤ! میں تمہیں اپنا ذاتی آفس بھی دکھاؤں گا۔ تم وہیں انتظار کر لینا۔''

''چلو! جیسے تمہیں ٹھیک لگے۔'' وہ بولی، لہذا چہکا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر تم بھی اپنے وفد کو وقت دو، میں وحید بھائی کو بتاتا ہوں۔''اُس نے کہا۔ پھر اُس سے بات کرنے کے بعد وہ وحید کو پیغام بھیجنے لگا۔ اُسکی دو دن پہلے ہی کامیاب آپریشن سے واپسی ہوئی تھی۔ ابھی وہ چھٹی پر تھا۔

''سر!'' دروازے پر دستک ہوئی، تو اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ فیصل سامنے تھا۔ شیر از نیا نیا دلہا تھا۔ آج ہی چھٹیوں سے واپس آیا تھا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ چہرے کی نرمی دوبارہ غائب ہو چکی تھی۔

''سر! آپکے دوستوں میں سے تین آچکے ہیں۔ باقی دو کو بھی منصوبے کے مطابق تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جانا ہے۔''اُس نے بتایا۔

''ہونہہ۔۔۔''اُس نے موبائل پر پیغام لکھتے ہوئے مصروف سے انداز میں سر ہلایا۔

''سر! گاڑی مطلوبہ مقام کے لیے یہیں سے نکلے گی۔ آپ کو بھی ساتھ ہی جانا ہے۔''

''میرا سامان گاڑی میں رکھ دینا۔ میں ساتھ نہیں جا رہا۔''اُس نے جواب دیا۔

''مطلب؟''فیصل حیران ہوا۔

''اردو سمجھ نہیں آتی؟''اُس نے بھنویں اُچکا کر پوچھا۔

''میرا مطلب! آپ ساتھ کیوں نہیں جا رہے؟''اُس نے ذرا سنبھل کر پوچھا۔

''مجھے کچھ کام ہے۔ وہ مکمل کر کے میں مطلوبہ مقام تک پہنچ جاؤں گا۔''اُس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے!'' وہ چلا گیا تو نوید اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر میں باقی تمام لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔ جب فرخ صاحب آئے تو اُن سب کو مشاورتی کمرے میں بلایا گیا۔ نوید بھی پہنچ گیا۔ راستے اور مقام کے حوالے سے کچھ ہدایات تھیں، جو وہ ساتھ بیٹھے ایک انجان چہرے کو دے رہے تھے۔ یہی شخص انہیں لیکر جانے والا تھا۔

''یہ غزنوی ہے۔''انہوں نے درمیان میں انجان چہرے کا تعارف کروایا۔''یہ بھی ایف آئی اے کا قابل نوجوان ہے۔یہ جگلوٹ تک تم سب کو ساتھ لیکر جائے گا۔جگلوٹ کے آگے suv نہیں جائیگی،وہاں سے آگے کا راستہ نوید کے ذمّے ہے۔''اُنہوں نے کہا۔

''جگلوٹ پہنچ کر سب کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا کیونکہ میں بعد میں آؤں گا۔''نوید کی سنجیدہ آواز گونجی۔

''تم ساتھ نہیں جارہے؟''فرخ صاحب نے اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''مجھے کچھ بہت ضروری کام ہے،جو مکمل کرکے آؤں گا۔''وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔

''ٹھیک ہے!پر جلدی پہنچنا۔''اور وہ اُسے اپنی مرضی کرنے دیتے تھے۔

''کیا اب ہم جان سکتے ہیں کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟''حسین نے پوچھا۔

''ابھی تو جگلوٹ!اُس سے آگے نوید کی مرضی کہ وہ کہاں سے لیکر جاتا ہے۔''انہوں اب بھی منزل کا پتہ نہیں دیا۔حسین نے نہایت ہی برامنہ بنایا تھا۔

''چلو غزنوی!تم گاڑی میں سامان لوڈ کرواؤ،تب تک فیصل!تم ان سب کو لیونگ ایریا میں بٹھاؤ۔''انہوں نے پہلے غزنوی پھر فیصل کو مخاطب کیا تھا۔ اُنکے حکم کے مطابق سب اُٹھ گئے۔نوید وہیں بیٹھا رہا۔اسے فرّخ صاحب سے کچھ بات کرنی تھی۔

فیصل انہیں لیونگ ایریا میں لے آیا۔یہاں مختلف آفس کے دروازے کھلتے تھے،یہ انتظار گاہ نہیں تھی۔پر ایف آئی اے کے افسران اکثر یہاں بیٹھ کر اپنا کوئی نہ کوئی کام کرتے،کبھی آرام کرتے تو کبھی کھانا پینا کھاتے نظر آتے تھے۔انہیں بھی وہاں بٹھا دیا تھا۔ویسے تو عام آدمی کو وہاں رسائی حاصل نہ تھی،پر فرّخ صاحب کا حکم تھا۔انہیں خُفیہ طریقے سے عمارت سے نکلنا تھا۔بنا کسی کی نظروں میں آئے۔

''جگلوٹ سے آگے تو استور آتا ہے۔یا تو ہم گلگت جارہے ہیں یا اسکردو۔ ''یہ اندازہ مقدّم نے لگایا تھا۔وہ انہی علاقوں میں پلا بڑھا تھا۔

''میری گاڑی جب ایف آئی اے والے لے کر جارہے تھے۔تب ابّو مشکوک ہوگئے تھے،میں نے انہیں کہا کہ سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ میری گاڑی لیکر جارہا ہے،ڈرائیور ہے۔مجھے مقام پر پہنچا کر یہ گاڑی گھر واپس چھوڑ جائے گا۔''عمر نے علی کو بتایا تھا۔رضا گھوم پھر

کے پورے لیونگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیونگ روم تھا تو خوبصورت، دیواروں پر مختلف آپریشنز، یا حکومتی ارکان کی طرف سے ملنے والے اعزازات کی تصاویر لگی تھیں۔

''میں نے بھی کم و بیش ایسا ہی بہانہ بنایا ہے۔'' جواب مقدّم نے دیا تھا۔ اتنی دیر میں اُنہوں نے دائیں طرف والے کمرے میں نوید کو آتے دیکھا۔ وہ لیونگ روم سے نہیں آیا تھا، بلکہ اپنے کمرے کے پیچھے والے دروازے سے داخل ہوا تھا۔ اب وہ اُسے اپنی میز پر رکھے کچھ اہم کاغذات میں سر دیئے بیٹھا دیکھ سکتے تھے۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔ لیونگ روم میں الگ گہما گہمی ہو رہی تھی۔ اب نوید کسی سے فون پر بات کرتا نظر آرہا تھا۔ یہاں تک اسکی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی، بس لب ہلتے نظر آرہے تھے۔

''اے بات سنو!'' حسین نے پاس سے گزرتے، خوشبو اڑاتے، ہنستے مسکراتے، خوش باش سے شیراز کو مخاطب کیا۔

''جی فرمایئے!'' اُس نے ادب سے پوچھا۔ اب نوید کے کمرے میں عام سے لباس میں، کسرتی ڈیل ڈول والے اُسکے بھائی اور ساتھ میں ایک سنجیدہ مگر معصوم چہرے والی خاتون کو داخل ہوتے دیکھا جاسکتا تھا۔

''کیا تم نے کبھی اپنے ایس ایس پی صاحب، جناب نوید عالم کو ہنستے ہوئے دیکھا ہے؟'' حسین نے پوچھا تو آپس میں محو گفتگو عمر، علی اور مقدّم نے رک کر انہیں دیکھا۔ سارے لیونگ روم کا چکر کاٹنے کے بعد رضا بھی اُدھر ہی آگیا۔

''ہنستے ہوئے تو نہیں۔۔۔۔'' جواب دیتے شیراز کی نظریں نوید کے کمرے تک گئیں۔ ''پر ہاں! مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔'' اُس نے کہا۔ نوید اپنے سامنے بشریٰ کو دیکھ کر بیساختہ کھڑا ہوا۔

''ہم نے تو نہیں دیکھا۔'' حسین نے مایوسی سے کہا۔

''اب دیکھ لو!'' یہ کھوئی کھوئی سی آواز مقدّم کی تھی، جس کی حیران نظریں نوید کے کمرے کی جانب تھیں۔ کم و بیش ایسی ہی حالت باقی سب کی بھی تھی۔ حسین نے بھی اُسی جانب دیکھا اور اُسکا پورا کا پورا منہ ہی کھل گیا۔

ایس ایس پی نوید عالم مسکرا رہا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ اُسکی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں، اُسکا چہرہ بھی مسکرا رہا تھا۔ انداز میں نرمی نجانے کہاں سے اُمڈ آئی تھی؟

وحید، فرخ صاحب سے ملنے جا چکا تھا۔ بشریٰ ہر ایک شے کی جانب اشارہ کر کے نوید سے کچھ نہ کچھ سوال کر رہی تھی، وہ دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے پوری توجہ سے اُسکی بات سنتا، پھر اُسے جواب دیتا۔ وہ اُسکی ریک میں رکھی تصاویر اور اعزازات اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہی تھی، جسے ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ نوید کے چہرے سے مُسکراہٹ جدا نہ ہو رہی تھی، نظریں تھیں کہ بشریٰ کے چہرے کا طواف کرتیں، وہاں سے ایک پل ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ انداز میں ایک عقیدت اور ایک احترام سا تھا۔

''دیکھو ذرا۔۔۔ دیکھو اِس آدمی کو!'' حسین کے منہ سے تو الفاظ ہی نہیں ادا ہو رہے تھے۔

''دیکھ ہی رہے ہیں اتنی دیر سے۔'' رضا نے تپ کر کہا تھا۔

''میں یہاں اِسکو مسکراتا دیکھنے کے لیے ترس گیا اور یہ ہے کہ کیسے ہنس ہنس کر ان خاتون سے بات کر رہا ہے۔'' حسین کے اپنے ہی غم تھے۔

''اور کتنی عزت سے۔'' مقدّم نے کہا۔

''ہاں! ہمیں تو گھورتا ہی ایسے ہے، جیسے نظروں سے ہی سالم نگل لے گا۔'' حسین اور اُسکے نہ ختم ہونے والے دکھ!

''ویسے یہ خاتون ہیں کون؟'' علی نے سب کی زبانوں کا سوال چھینا۔

''نوید صاحب کی پسندیدہ عورت!'' یہ جواب شیراز نے دیا تھا۔ سب نے پلٹ کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میں نے نوید صاحب کو سوائے اُنکی اہلیہ کے، کسی کے ساتھ مسکراتے نہیں دیکھا۔'' شیراز نے مسکراتے ہوئے بتایا تو اب ایک بار پھر سب نے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔

''اُسکی بیوی جو اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی؟'' علی نے صرف سوچا، پر کہا کچھ نہیں۔ نوید کے لیے دل میں عزت کچھ اور بڑھی۔

''آپ لوگ آجائیں!'' لیونگ روم کا دروازہ کھول کر غزنوی نے انہیں مخاطب کیا تھا۔

''چلیں ہمیں نکلنا ہے۔'' شیراز نے انہیں کہا تو سب سر ہلاتے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اپنے کمرے میں نوید ابھی بھی بشریٰ کو اپنی چیزیں پوری خوشی سے دکھا رہا تھا۔

---------+--------+--------

''نوید! تم مجھ سے روز بات کرو گے نا؟'' وہ آنکھوں میں آس لیے اُس سے پوچھ رہی تھی۔ پہلے بھی نوید جب کبھی آپریشنز پر گیا تو اُس سے بات کیے اُسے کئی کئی ہفتے اور بعض دفعہ مہینہ ہو جاتا۔ اُسکا دل ایسا خالی ہو جاتا جیسے اُس میں کچھ نہ ہو۔ وہ جلے پیر کی بلی کی مانند اُسکا انتظار کرتی تھی۔ لیکن تب بچے تھے، تو وہ خود کو مضبوط بنا لیتی۔ پر اب؟ اب وہ کیا کرے گی؟

''میں تم سے روز بات کروں گا۔ میرا وعدہ ہے!'' وہ اپنی من مانی کرتا تھا، اور فرخ صاحب اُسے کرنے دیتے تھے۔ ہاں! وہ بشریٰ سے رابطہ کر سکتا تھا۔

اِس وقت وہ دونوں نوید کی والدہ کے گھر میں موجود تھے، بشریٰ کے لیے مختص کیے گئے کمرے میں وہ سامان رکھنے آیا تھا۔ جب اُس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے؟ یہاں برابر میں ایک گھر ہے۔ پناہ گاہ نام ہے اُسکا، جزا وہاں ٹیچر ہے۔ اُس گھر میں ایک شخص ہے، جس نے تقریباً تیس کے قریب یتیم اور لاوارث بچوں کو ایڈاپٹ کیا ہوا ہے۔ وہ بچے ہر عمر کے ہیں، چھوٹے اور بڑے بھی۔ تم بھی جانا وہاں جزا کے ساتھ، تمہیں اچھا لگے گا۔'' نوید نے کہا۔

''کیا وہ کوئی یتیم خانہ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''اوں ہوں!'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔ بس ایک شخص ہے، جس نے ان بچوں کو اپنے خاندان کی طرح رکھا ہے۔ وہ انکا فوسٹر فادر ہے۔'' اُس نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نوید اُسکا سامان سیٹ کرنے لگا تو وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''اب میں نکلوں گا۔ امی وحید بھائی کی طرف ہیں، جبکہ جزا یہیں ہے۔ تم پریشان نہ ہو نا، میں پہنچ کر تمہیں اطلاع دے دوں گا۔'' اُس نے کہا۔

''تم چپ کیوں ہو؟'' نوید نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا تو، اُس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں۔

''تم واپس آؤ گے نا؟'' وہ کیا سوچ رہی تھی؟

''بشریٰ!'' اُس نے اسکے دونوں ہاتھ تھامے۔

''میں کیوں واپس نہیں آؤں گا؟''

''واپس ضرور آنا نوید! میرے لیے آنا۔ میرا کوئی نہیں ہے تمہارے علاوہ!'' نوید کا دل دکھا، اُسکے آنسو گراں گزرے تھے۔

''تمہارے لیے ضرور واپس آؤں گا۔'' اس نے کہا تو وہ سر جھکائے رو دی۔ پہلے وہ ایسے نہیں کرتی تھی۔

''میں ضرور آؤنگا۔ صرف تمہارے لیے۔۔۔'' اُس نے اُسکے آنسو صاف کرتے تسلی دی۔

''اب رو تو مت، ورنہ میرے لیے جانا مشکل ہو گا۔ مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کیا کرو۔'' اُس نے مسکراتے لہجے میں کہا تو وہ آنسو پونچھتی ہنسی۔

''اب جاؤ! خیریت سے جاؤ! اور سلامتی سے واپس آؤ۔'' اُس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ مسکرایا۔ پھر وہ اُسے چھوڑنے کے لئے باہر تک آئی۔

نوید نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک بار پھر اُسے دیکھا۔ وہ دروازے پر اُداس سی کھڑی تھی۔ اُس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو تھوڑی کے قریب لے جا کر مسکرانے کا نشان بنایا اور ساتھ خود بھی مسکرایا۔ اسکے اُداس چہرے پر مسکراہٹ بکھیر ہے۔ پھر نوید نے سینے پر ہاتھ رکھا، اور سر جھکا کر اُسے خدا حافظ کہا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بشریٰ نے دروازہ بند کر دیا تو وہ تسلی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

----------+---------+--------

دس سال قبل (مقدّم کے نکاح کے بعد)

''تم اتنے بیمار تھے تو ہم میں سے کسی کو بتا دیتے، تم ویسے ہی اکیلے رہتے ہو، پتہ نہیں اپنا خیال کیسے رکھ رہے ہو گے۔ ہوا کیا تھا تمہیں؟'' نوید نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ایسی بھی بڑی بات نہیں تھی، بس بخار تھا اور اتنی سی بات کے لیے کیا تنگ کرتا تم لوگوں کو؟ اب بہتر ہوں۔ الحمد اللہ!'' رضا نے آہستہ آواز میں کہا، اُسکا گلا ابھی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ آواز نکلنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''خیر مجھے تو اب بھی بہتر نہیں لگ رہے'' نوید رضا مند نہیں لگتا تھا۔

''بہتری آجائے گی طبیعت میں، جب ہم شمالی علاقہ جات جائینگے'' حسین نے کہا۔

''کیا مطلب تم سب سنجیدہ ہو؟'' مقدّم نے حیرت سے پوچھا۔ وہ سمجھا تھا کہ شمالی علاقی جات جانے والی بات، وہ لوگ ازراہ مذاق کر رہے ہیں۔

''میں تو بالکل ہوں'' نوید نے جواب دیا۔

''مقّی ہمیں اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا۔'' حسین نے دکھی ہونے کی اداکاری کی۔

''صرف تمہیں۔'' مقدّم نے تصیح کی۔

''تو کب جانا ہے؟'' نوید نے اُنہیں پھر سے غیر سنجیدہ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں اگلے ماہ چلتے ہیں۔ اور کون کون سی جگہ دیکھنی ہے، اِسکا فیصلہ مقدّم کرے گا کیونکہ یہ اُن علاقوں کو بہتر جانتا ہے'' عمر نے کہا۔ کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا رضا کے علاوہ سب ہی نے اپنی پلیٹوں میں کھانا لینا شروع کر دیا تھا۔

''تم کیوں نہیں لے رہے؟'' علی نے اُسکو ٹیک لگائے بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

''لیتا ہوں۔'' پھر مختصر سا جواب۔

''اگلے مہینے نہیں، اُسکے اگلے مہینے بھی نہیں اور اُسکے اگلے دو مہینے بھی نہیں۔'' نوید نے اچانک ہی کہا۔ رضا نے پلیٹ میں چند چمچے چاول نکالے پھر اُنہیں چمچ کی مدد سے بس یہاں وہاں ہلانے لگا۔ منہ میں اُس نے اب تک ایک لقمہ بھی نہ ڈالا تھا۔

''کیوں بھئی؟ ابھی تو بہت اچھل رہے تھے جانے کے لئے؟'' حسین بدمزہ ہوا۔

''کیوں کہ اگلے چھ مہینے تک تو علی کہیں نہیں جانے والا اور یہ نہیں جائے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔''نوید نے اعلان کیا۔

''کیوں علی تمھاری بیوی ہے، جو اُسکے بنا تمہارا گزارا نہیں؟''حسین نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم کھا کیوں نہیں رہے رضا؟''اُنکی باتوں سے بے نیاز علی، رضا کو بغور دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

''بیوی کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ علی کیوں نہیں جائے گا؟''مقدّم، حسین سے زیادہ مشکوک ہوا۔

''اِسکی شادی ہے نا اگلے مہینے۔''رضا سے بات کرتا علی، نوید کی بات پر جھٹکے سے اُنکی جانب مڑا تھا۔ باقی سب نے اِس بات کو مذاق کے پیرائے میں ہی لیا تھا۔

''ارے ہاں! میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ میری شادی ہے دو مہینے بعد۔''اُس نے جتنے آرام سے بم پھوڑا تھا، اتنی ہی تیزی سے وہاں سب کو سانپ سونگھا تھا۔ مقدّم تو باقاعدہ منہ میں چمچ ڈال کر نکالنا ہی بھول گیا تھا۔

''ایسے مت دیکھو مجھے، میں بتانے ہی والا تھا۔''وہ گڑبڑایا۔

''ہاں! اِس بیچارے کو تو خود ایک مہینے پہلے پتہ چلا ہے۔''اب کہ نوید نے دوسرا بم پھوڑا تھا۔ علی نے اسکو کُہنی مارنی چاہی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ سب شدید صدمے کے عالم میں اُسے دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں پتہ تھا؟''سب سے پہلے حسین کا سکتہ ٹوٹا، تو اس نے سنجیدگی سے نوید سے پوچھا۔ اُس نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر کھانا کھانا شروع کر دیا جیسے یہی دنیا کا سب سے ضروری کام ہو۔

''تمہیں پتہ تھا؟''اب کہ اُس نے مقدّم سے پوچھا۔ اُس نے منہ سے چمچ واپس نکال کر انتہائی دکھ سے نفی میں سر ہلایا۔ گھورتی نظریں علی پر ہی ٹکی تھیں۔

''اور تمہیں؟''اب کہ وہ عمر کی جانب متوجہ ہوا۔ اُس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی دوستی پر جہاں صرف ایک کو معلوم ہے اور باقیوں کو رشتے داروں کے طرح اطلاع دی جا رہی ہے۔'' حسین نے ملکہ جذبات بنتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں علی کو گھور رہے تھے اور وہ پوری دلجمعی سے کھانا کھاتے نوید کو، رضا اس پوری صورتحال پر بس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

''میں نے اپنے امّاں ابّا کو راضی کرنے سے لیکر بات پکی ہونے تک، اور وہاں سے آگے نکاح ہونے تک ایک ایک عمل، تم سب کو بتایا، اور دیکھو ذرا اس بیغیرت انسان کو!'' مقدّم نے تو شدت غم سے کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''اور وہ ساری باتیں ہم نے کتنی بیزاری سے اور کس قدر حالت مجبوری میں سنی تھیں یہ ہم سے پوچھو، بس اسی تکلیف سے تم سب کو بچانا چاہا تھا میں نے۔'' علی بھی ڈھٹائی سے بولا تھا۔

''چھوڑ دو اس بے شرم آدمی کو مقّی! ہم چاروں اسکی شادی پر جانے کے بجائے شمالی علاقہ جات ہی جائینگے۔'' حسین نے اُسے گھورتے ہوئے، اُسکی سزا تجویز کی۔

''چاروں سے تمہاری مراد؟'' نوید کے کان کھڑے ہوئے۔

''چاروں سے اِسکی مراد تم تو بالکل نہیں ہو۔'' مقدّم ٹھیک ٹھاک تپا ہوا تھا۔

''اُسکو وضاحت دینے کا موقع تو دو!'' عمر کے اندر کا ہمدرد انسان ہمیشہ کی طرح جاگ گیا تھا۔

''ہمیں کوئی وضاحت نہیں سننی۔'' مقدم کچھ سننے پر رضامند ہی نہ تھا۔

''میں دے بھی نہیں رہا۔'' علی بھی انکو خاطر میں نہ لا رہا تھا۔

''تم لوگوں کی اوور ایکٹنگ ختم ہو گئی ہو تو اُسکی بات بھی سن لو۔'' عمر نے ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کو لتاڑا تھا۔

''دیکھو رضا اور عمر!'' علی نے صرف اُن دونوں کو مخاطب کیا۔

''میرے ابّا مجھ سے دو سال سے ناراض تھے، اب اُنہوں نے مجھے خود بلا کر مجھ سے بات کی اور کہا کہ انہوں میں میرے لیے لڑکی پسند کی ہے اور وہ امتحانات کے دو ماہ بعد میری شادی کروانا چاہتے ہیں، تو میں کیسے منع کرتا؟ اور تم لوگوں کو اس لیے نہیں بتا سکا، کیونکہ مجھے خود تین سے چار ہفتے قبل یہ بات معلوم ہوئی، تو میں تم لوگوں کو کیسے بتاتا؟''اُس نے صرف اور صرف اُن دونوں سے ہی بات کی تھی۔

''جیسے نوید کو بتایا تھا۔''حسین چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

''آغا کا نکاح تھا نہ یار درمیان میں، اسی لیے نہیں بتایا ہوگا۔''عمر نے اُسکی طرفداری کرنے کی کوشش کی۔

''بہت ہی بھونڈا بہانہ ہے۔''مقدم نے یہ بہانہ بھی رد کیا۔

''دیکھو! میرا کوئی بھائی ہے نہیں، اور کزن بھی کوئی نہیں لہٰذا اب تم تینوں نے ہی میری مدد کرنی ہے۔''علی نے ان دونوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالا تھا۔

''اور یہ دو لوگ نہیں آرہے کیا؟''عمر نے اشارے سے پوچھا۔

''یہ دو لوگ تو شمالی علاقہ جات نہیں جا رہے کیا؟''اُس نے دوبدو جواب دیا۔

''صرف ہم دو نہیں، پلان سب کا تھا خصوصی طور پر اس بھائی کا۔''مقدّم نے انگلی سے نوید کی جانب اشارہ کیا۔

''میں نہیں جا رہا۔''اُس نے سب سے پہلے یوٹرن لیا۔

''میں بھی نہیں جا رہا۔''مقدّم کے لاکھ گھورنے کے باوجود عمر نے بھی بیان بدلا۔

''تمہاری کیا رائے ہے؟''اب کہ حسین نے رضا کو بھی گفتگو میں گھسیٹا تھا۔

''میرے پاس فضول پیسے نہیں ہیں برباد کرنے کو، لہٰذا میں شادی میں ہی آرہا ہوں۔''اُس نے بھی ہری جھنڈی دکھائی۔

''ویسے پیسے تو ابھی میرے پاس بھی نہیں ہیں۔''نوید کو ایک اور بہانہ یاد آیا۔

''تمہیں پیسوں کی ضرورت ہی کہاں ہے؟ تم اپنا ایک قدم ہی بڑھا لو تو اگلے شہر میں ہوگے۔''حسین نے اُسکے قد کو نشانہ بنایا تھا۔

''اب جبکہ سب کا یہی ارادہ ہے تو میں بھی علی کو معاف کرتے ہوئے شادی میں آنے کو تیار ہوں۔'' مقدم نے اچانک ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تو اِس غدّاری پر حسین نے زوردار قسم کا تھپڑ اُسکے کندھوں پر جڑا تھا، وہ بلبلا اُٹھا۔

''حالانکہ آنا تم لوگوں نے میری شادی میں ہی ہے۔ لیکن فضول کے ڈرامے کرنا ضروری ہے۔'' علی نے بیزار ہوتے ہوئے کہا، پھر حسین کو دیکھا جو ابھی تک روٹھا بیٹھا تھا۔

''چلو یار پریشان نہ ہو، ہم یہ گھومنے کا منصوبہ دو چار مہینے بعد بنالینگے۔'' علی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''رہنے دو، جنکی شادیاں ہو جاتی ہیں نا پھر وہ کبھی نہیں ملتے۔ یہ بھی تم آج آخری بار ہمارے ساتھ بیٹھ رہے ہو۔''

''تمہیں بڑا تجربہ ہے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوتا، میرا ابھی تو کل ہی نکاح ہوا ہے، دیکھ لو تم سب کے ساتھ ہوں۔'' مقدم نے فخر سے اپنی مثال دی۔

''وہ تو لیلیٰ اپنے گاؤں چلی گئی ہے، آج صبح ہی، اسی لیے تم یہاں ہو۔'' عمر نے دو منٹ میں اُسکا سارا فخر نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''ختم کرو اس موضوع کو اب، ہم سب اس عید کے بعد چلیں گے۔'' اب علی کو حقیقتاً غصّہ آ گیا تھا۔ لہٰذا سب نے فوراً سے حامی بھری اور انسان بن کر بیٹھ گئے، پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

''تو اُسکی نفسیاتی بیماری کی وجہ یہ تھی۔'' بالکل اچانک ہی حسین نے کہا تو وہاں قہقہہ پڑا تھا۔ علی نے دانت کچکچاتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔ نوید شادی کی تیاریوں پر بات کر رہا تھا، عمر رضا کو تھوڑی دیر پہلے حسین کی ماری گئی جگت کا مطلب سمجھا رہا تھا، جسے سمجھ کر وہ سر ہلا رہا تھا، مقدّم شمالی علاقے جانے کے سارے منصوبے ابھی سے طے کر رہا تھا۔

فضاء خوشگوار تھی، دوستی مضبوط تھی اور خوشیاں منتظر۔۔۔

لیکن ایسا دائمی تو نہیں رہنے والا تھا۔۔۔

وہ دوبارہ ایسے اکھٹے ہونے والے تھے۔۔۔

لیکن ایسے نہیں، اس مقام پر نہیں اور اِن حالات میں نہیں۔۔۔

قسمت میں اُنکا ایک ساتھ شمالی علاقہ جات جانا لکھا تھا۔

لیکن ابھی نہیں۔۔۔

اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ کسی اور وقت پر، کسی اور لمحے میں، اُنکی یہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔۔۔

لیکن تب نہ وہ ایک دوسرے کے دوست رہنے والے تھا نہ انکو ایسے کسی سفر کی خواہش رہنے والی تھی۔۔۔۔

ایک منصوبہ اُنہوں نے بنایا تھا اور ایک منصوبہ قدرت نے۔۔۔۔

----------+---------+--------

ایک منصوبہ انہوں نے بنایا تھا، اور ایک منصوبہ قدرت نے۔۔۔

قسمت میں انکا ایک ساتھ شمالی علاقہ جات جانا لکھا تھا۔۔۔۔

آج، ابھی، پورے دس سالوں بعد۔۔۔۔

اس بار بھی منصوبہ نوید کا تھا۔۔۔

وہ جا رہے تھے۔۔۔۔

عید کے بعد ہی جا رہے تھے۔۔۔۔

اور علی کی شادی کے پورے دو ماہ بعد۔۔۔۔

مقدّم کی شادی سے پہلے۔۔۔۔

قدرت نے انکی خواہش حرف با حرف پوری کی تھی۔۔۔۔

قسمت اُنکی خواہش پر، دس سال پہلے ہنسی ضرور تھی۔۔۔۔

----------+---------+--------

(جاری ہے)

نحل کی سترہویں قسط کا اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میرے پیج اور ویب سائٹ پر شائع ہوگا۔ان شاءاللہ